قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۱۲۱۹

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	۲
فریضہ کی یاد دہانی	اعزاز الدین احمد خاں	۹
الحمد للہ	ایم بشیر احمد	۱۸
آویزشِ حق و باطل	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۳۴
حقائق و عبر	ادارہ	۴۵
شہرِ آشوب	غلام رسول ازہر	۵۵
تبصرۂ کتب	ادارہ	۵۷
افکارِ اقبالؒ	ثریا عندلیب	۵۸
اٹھ باندھ کمر	عبداللہ (بنگلور)	۶۳
بچوں کا صفحہ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۶
درس	ادارہ	۶۸
اسلام اینڈ دی ویسٹ (انگریزی)	پرنس آف ویلز	۶۹

انتظامیہ

چیئرمین بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خان

ناظم - محمد لطیف چوہدری

مجلسِ ادارت

مدیر مسئول - محمد لطیف چوہدری

معاون - ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر - عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع - سید عبدالسلیم

مطبع - آفتاب عالم پریس

مقامِ اشاعت

۲۵/بی، گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد ۴۷ — اپریل ۱۹۹۴ء — شمارہ ۴

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان —— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک —— ۱۸ امریکی ڈالر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

وضاحت

ہمارے قارئین میں سے کچھ اصحاب نے ہمیں یہ یاددہانی کرائی ہے کہ ہمارے اداریے سیاسی رنگ لئے ہوئے ہیں ان میں سے کچھ نے تو کبھی اس پارٹی، کبھی اس پارٹی کی حمایت کی بات بھی کی ہے ـــــ یاد دلایا ہے کہ طلوعِ اسلام سیاست میں دخل نہیں دیا کرتا۔

درست ہے ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے اور پارٹی بازی کو تو ہم فرقہ سازی ہی کا درجہ دیتے ہیں ـــــ ہماری حمایت کسی پارٹی کے لئے نہیں،

موجودہ جمہوریت کو تو ہم فرعونی سیاست کا حصہ سمجھتے ہیں جس میں VESTED INTRESTS ہمارے فرعونوں کی صورت قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرکے کبھی ایک کو ابھار کر اوپر لے آتے ہیں، کبھی دوسرے کو

ہماری وفاداریاں تو صرف اور صرف پاکستان کے مفاد سے وابستہ ہیں ـــــ کیونکہ ہمارے نزدیک یہ صحنِ مسجد کی طرح مقدس اور قابلِ احترام ہے، یہ صرف ایک خطۂ زمین، ایک ہوم لینڈ ہی نہیں، جہاں کروڑوں انسان عزت و آبرو کی زندگی گزار رہے ہیں، کم از کم اغیار کی غلامی کے جوئے سے آزاد اپنے مواقع زندگی ڈھونڈنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ـــــ

اس سرزمین نے مسلمانوں کے لئے وہ میدان کھول دیئے ہیں، ترقی کے وہ موقعے بہم پہنچائے ہیں کہ جن کا ان کے تصور میں بھی نہ آ سکتے تھے، جو لوگ کلرکی کے لئے ترستے رہتے وہ سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کے عہدے تک جا پہنچے، جو معمولی جنرل مرچنٹ سے اوپر کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے سپر سٹوروں کے مالک بن گئے، دکانوں کے مالک بن گئے، ـــــ

اپنے شعبے کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ایک صاحب جنہیں اپنے مسلم لیگی ورکر ہونے کا بڑا مان تھا، ان دنوں کی برکتوں کا ذکر کرتے ہوئے نوجوانوں سے یہ کہتے سنے گئے کہ تم لوگوں کو کیا معلوم ساری انارکلی

میں مسلمانوں کی ایک دکان ہوتی تھی' مال روڈ پہ ایک بھی نہیں تھی ——— ان سے یہ کہنا شاید دانستہ بھلا رہے تھے کہ ان جیسے شخص ملکی سطح کے عہدے پہ پہنچنے کے خواب بھی نہ دیکھ سکتے تو اگر خدانخواستہ پاکستان وجود میں نہ آتا۔

یہ سب کارخانے، کاروبار، عہدے، خوشحالی اپنی جگہ پر مگر یہ ہمارا مقصود نہ تھا' یہ تو ضمنی فوائد ہیں ——— ایک بار کسی بہت بڑے انگریز سیاستدان نے قائداعظم سے کہا تھا کہ پاکستان اقتصادی طور پر کبھی خوشحال ملک نہیں ہوسکتا' کیا آپ یہ نہ چاہیں گے کہ آپ ایک خوشحال ہندوستان کے باشندے ہوں۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی' قائداعظم نے جواب دیا ——— کیا آپ ایک غریب اور بدحال مگر آزاد انگلستان کے باشندے ہونا پسند فرمائیں گے یا خوشحال مگر جرمنی کے غلام انگلستان کے ——— انگریز شرمندہ ہوا' قائد نے فرمایا جب آپ اپنے لئے یہ صورتحال پسند نہیں کرتے تو ہم سے یہ کیوں امید رکھتے ہو ———

یہ بھی بجا مگر ہمارے نزدیک یہی کافی نہیں' ہمارے لئے قیامِ پاکستان محض ایک سیاسی جدوجہد نہیں تھی' آزاد ملک کا قیام ہی منزلِ مقصود نہ تھا۔ (ایک آزاد ملک کا قیام بھی کچھ کم تر کامیابی نہیں کہی جاسکتی' ——— بڑے بڑے بادشاہوں نے' جرنیلوں نے ملک فتح تو کئے' کسی کے حصے میں یہ سعادت نہ آئی کہ وہ دنیا کے نقشے پہ ایک نئے ملک کا بانی کہلاتا ——— یہ سعادت حصے میں آئی تو قائداعظمؒ کے انہوں نے ایک پسماندہ اور غریب قوم کو دنیا کی دو بڑی طاقتوں' انگریزی سامراج اور بانیا راج کی مخالفت کے علی الرغم یہ خطۂ زمین حاصل کرلیا)۔ ہمارے لئے یہ جدوجہد ہمارے دین کا تقاضا تھا'

اس بات کو آزادی کے ان سارے سالوں میں کسی نے اجاگر نہیں کیا سوائے طلوعِ اسلام کے کہ پاکستان کی جدوجہد محض ایک خطۂ زمین حاصل کرنے کا نام نہ تھا' یہ دنیا میں ایک انقلابی تصور کی تحریک تھی ——— کہ قومیں جغرافیائی لکیروں، رنگ یا زبان کے اشتراک، لباس کی یگانگت، نسل کے اشتراک سے وجود پذیر نہیں ہوتیں' ان کی بنیاد اس تصورِ حیات پہ ہوتی ہے جو ان لوگوں کے رگ وپے میں ایمان کی صورت میں جاگزیں ہوتا ہے' قومیں آئیڈلزم اور ایمان کے اشتراک سے وجود میں آتی ہیں'

یہ اسلام کے اس انقلابی تصور کی تحریک تھی جو مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔

یہ خطۂ زمین' اسلام کو اس شکل میں جلوہ آرا کرنے کا عزم تھا جو چودہ سو سال پہلے سرکارِ دوعالمؐ نے مدینے میں قائم کرکے روم وفارس کے سامراجوں تلے پسے ہوئے لوگوں کو آزادی کے پیغام کی صورت میں دیا تھا ———

قائداعظمؒ کے الفاظ میں یہ خطہ قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی کے لئے حاصل کیا گیا تھا'

قائداعظمؒ کو مہلت نہ ملی اور قوم کے ان لوگوں نے جن کے گھر دانوں سے اور دل لالچ سے بھرے ہوئے تھے منزل لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دی۔ پیش پا افتادہ مادی مفاد ہر شخص کا مطمح نظر ہو گیا۔ ساری قوم کو ان لوگوں کی پالیسیوں نے ایک پاگل دوڑ میں مبتلا کر دیا ـــــ تکاثر کی ایک ایسی اندھی دوڑ جو مقابر پہ جا کے ختم ہوتی ہے ـــــ

ہمارے شہر بلند و بالا عمارتوں سے مزین ہیں، مارکیٹیں سامانِ عیش سے بھری ہوئی ہیں، دکانیں سامان سے ابل رہی ہیں، سڑکیں گاڑیوں کی فراوانی سے اپنی فراخی کھو چکی ہیں، دل تنگ ہیں ـــــ اوپر اوپر کے طبقے میں ایک مصنوعی خوشحالی اور فراوانی ہے۔ فائیو سٹار ہوٹلوں کی رونقیں، فیشن شو (ہر سماجی تقریب ایک فیشن شو سے کم نہیں ہوتی) اس کے گواہ ہیں اور غریب کے لئے رزق کے دروازے تنگ سے تنگ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ الغرض پاکستانی معاشرہ اس وقت

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست

کی عملی تصویر بنا ہوا ہے۔

یاد رکھئے۔ اللہ تعالیٰ نے استخلاف فی الارض کے متعلق یوں فرما دیا ہوا ہے کہ ہم تمکن فی الارض حکومت و مملکت دے کر یہ دیکھیں گے کہ تم کیا کرتے ہو (کس قسم کا معاشرہ، کس قسم کی معیشت، کس قسم کی حکومت قائم کرتے ہو)۔ یہ ایک امتحان، یہ ایک آزمائش ہے۔

ہمارے لئے سوچنے کا مقام ہے، کیا ہم اس آزمائش پر پورے اتر رہے ہیں، کیا ہم نے یہاں عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کر دیا ہے، کیا ہم اس سمت میں رواں ہیں ـــــ یا اس کی مخالف سمت میں قدم بڑھا رہے ہیں ـــــ

کیا غریب اور امیر میں تفاوت کم ہو رہی ہے۔

کیا معیشت یوں صورت پذیر ہو رہی ہے کہ دولت سارے معاشرے میں گردش کر رہی ہے جیسے خون سارے انسانی جسم میں، یا یہ صرف اوپر کے طبقے ہی میں رواں ہے ـــــ

کیا سب کو انصاف حاصل ہے۔

کیا سب کو تعلیم کی سہولتیں حاصل ہیں۔

کیا سب کو علاج معالجے تک رسائی ہے۔

کیا سب کو اطمینانِ قلب میسر ہے۔ کیا ہمارے دل سوائے خوفِ خدا ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو گئے ہیں ـــ کیا ہمارے دل آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ کیا ہم حزن سے نجات پا چکے ہیں۔

اگر نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے پاکستان دے کر جو ذمہ داری ہم پر ڈالی تھی ہمارا فرض ہے کہ سوچیں کس حد تک اس پر پورے اُتر رہے ہیں،

ہر شخص اپنی جگہ جوابدہ ہے مگر اربابِ اختیار سب سے زیادہ جوابدہ ہیں کہ ان پہ ذمہ داری سب سے زیادہ ہے ——

ہم جو اربابِ اختیار کو ملک کی سیاسی افراتفری، معاشی ابتری، اخلاقی زبوں حالی کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو کوئی خاص سیاسی جماعت یا سیاسی شخصیت ہماری مخاطب نہیں ہوتی۔

ہم آج ایک بار پھر یہ بات دہرانا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم کسی سیاسی جماعت سے منسلک نہیں، ہمارے پیشِ نظر صرف اور صرف پاکستان کا تحفظ، اس کی بہتری اور اس کے حالات کا رُخ اسلام کے اس انقلابی تصوّر کی جانب موڑنا ہے جو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیشِ نظر تھا جس میں مقصود بندوں کے نہیں خدا کے قانون کا نفاذ تھا —— یعنی قرآن کے اصول و احکام کی حکمرانی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعزاز الحسن احمد خان

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵/۶۷)

فریضہ کی یاددہانی

(جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ ۲۳ مارچ ۹۴ء میں چیئرمین کا خطاب)

تمہید

خواتین و حضرات! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

ادارہ کا چیئرمین منتخب کر کے آپ نے جس اعتماد کا اظہار مجھ پر کیا ہے اُسے میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ دعا گو ہوں کہ جو ذمہ داری آپ نے مجھے سونپی ہے (اور جو میں نے سوچ سمجھ کر قبول کی ہے) اس سے احسن طریقے سے عہدہ برا ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ میں کہاں تک آپ کی توقعات پر پورا اُترا ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ ادارہ کے فریضہ کے حصول کے لئے، آپ کے مشورے اور تعاون کے ساتھ، ایک منظم طریقے سے آگے بڑھوں۔ شاید کہ یہ جدوجہد ہماری عاقبت سنوارنے کا باعث بن جائے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ یہ موقع مجھے آپ جیسے مخلص حضرات کی ہم رکابی میں میسر آرہا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ کہتا چلوں کہ یہ محض اتفاق ہے کہ ادارہ کے سربراہ کے لئے آپ کی نظرِ انتخاب مجھ ناچیز پر پڑی۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ میں نہ تو کوئی علامہ ہوں، نہ عالم نہ فاضل، قرآن حکیم کا ایک نہایت ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ انتظامی امور کا تھوڑا بہت تجربہ رکھتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہ میری کوئی پوزیشن ہے نہ کوئی دعویٰ۔ ہاں البتہ طالب علم کی حیثیت سے قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا شوق ہے جسے انتہا تک لے جانا چاہتا ہوں۔ اس شوقِ بے پایاں کے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں ؎

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں (اقبالؒ)

یقین کیجئے کہ آپ کی پیش کش قبول کرنے کا جذبۂ محرکہ ہی میری "سادگی" ہے ــــ "کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے۔"

میں نے سربراہ کی حیثیت اپنا قد بڑھانے کے لئے قبول نہیں کی بلکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کی ہے جو نبیٔ اکرمؐ کے بعد امت کا فریضہ تھا۔ یعنی ہم سب کا۔ میرا۔ آپ کا۔ ہمارے ادارہ کے وجود کا مقصد بھی اسی فریضہ کی سرانجام دہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ فریضہ ہماری نگاہوں سے یکسر اوجھل تو نہیں ہوا ہے کچھ دھندلا ضرور گیا ہے۔ اسے واضح طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے، یعنی یاددہانی ــــ کی ضرورت ہے' تاکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس پیدا ہوتا رہے۔ قرآنِ حکیم بار بار کہتا ہے کہ وہ لوگوں کی یاددہانی کراتا ہے۔ یہ یاددہانی کس بات کی ہے؛ قرآنِ حکیم اپنی فراموش کردہ تعلیم کی یاددہانی کراتا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ وہی مستقل اقدار جو وقتاً فوقتاً دی جاتی رہیں، وہ انسانوں کی توجہ انہی کی طرف مبذول کراتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی پیروی میں، میں نے بھی کوشش کی ہے کہ آپ کو اس امر کی یاددہانی کراؤں کہ رسولُ اللہ کے بعد، حضورؐ کے اُمتی ہونے کی نہج سے اب فریضۂ تبلیغِ رسالت یعنی فریضۂ تبلیغِ قرآن ہماری (مسلمانانِ عالم کی) ذمہ داری ہے۔ اس فریضہ کو قرآنِ حکیم اور اسوۂ رسولِ اعظمؐ کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مناسب ہوگا پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ نزولِ قرآن اور بعثتِ نبیٔ اکرمؐ کا مقصد کیا ہے۔

فریضہ کی یاددہانی قرآنِ کریم کی روشنی میں

نزولِ قرآن و بعثتِ نبیٔ اکرمؐ کا مقصد یہ تھا (ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے جو نظامِ زندگی قرآنِ حکیم میں متعین کیا ہے اسے تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچایا جائے تاکہ تمام لوگ اسی نظام کے تحت زندگی بسر اور اس طرح ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرلیں۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کی بعثت کا مقصد ہی آپؐ کا فریضۂ حیات تھا۔ حضورؐ کا فریضۂ حیات اب ہمارا (انکی امت) کا فریضہ ہے۔

جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ رسول کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات جو اسے بذریعہ وحی ملتے ہیں انسانوں تک پہنچائے۔ ان کی غرض و غایت سمجھائے۔ اسے تبلیغِ رسالت کہتے ہیں۔ اور یہ بھی رسول کے فرائض میں شامل ہوتا ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں ایک ایسا عملی نظام قائم کرے جس میں افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کی ذات کا ارتقاء ہوتا جائے (۵:۴۸)۔ مثلاً حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے رسول ہوں۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ (۷:۶۲) "میں اپنے ربّ کے پیغامات، تم کو پہنچاتا ہوں"۔ حضور نبیٔ اکرمؐ کے متعلق ہے:

يَاۤ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ
اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ
مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(۵:۶۷)

"اے رسولؐ! تم اس ضابطۂ ہدایت کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو تاکہ کوئی شخص صحیح راہ نمائی نہ پہنچنے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے (۶:۷۰)۔ تمہارا فریضہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے (۱۳:۴۰)۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یہ فریضۂ رسالت کی عدم ادائیگی ہوگی۔ تم ان لوگوں کی مخالفت کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ اللہ تمہارے مشن کو مخالفین کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھے گا (۳:۱۴۳)۔ جو لوگ اس کا اس کا فیصلہ کرلیں کہ ہم نے کسی کی بات مانی ہی نہیں، خواہ وہ کیسی ہی حق و صداقت اور علم و بصیرت پر مبنی کیوں نہ ہو، تو ایسے لوگ کبھی راہِ راست پر نہیں آسکتے (۲/۶-۷)"

ہم یہ جانتے ہیں کہ سابقہ رسول ایک ایک قریہ میں، ایک ایک قبیلہ یا قوم کی طرف آتے تھے لیکن رسول اللہ تمام نوعِ انسانی کی طرف رسول تھے (۴:۱۷۰)۔ نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اس پیغامِ خداوندی کو نسلی، قبائلی، وطنی، لسانی حدود و قیود سے ماورا، اپنے ذرائع ابلاغ کے مطابق تابحدِ امکان دُور دُور تک پہنچایا اور اس کے مطابق نظام قائم کرکے، دنیا کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ ممکن العمل بھی ہے اور اس قدر خوشگوار نتائج کا حامل بھی۔ وہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹:۳۳) کا عملی مظاہرہ تھا۔ بدقسمتی سے یہ نظام آج اپنی اصلی شکل میں، کہیں بھی موجود نہیں، لیکن لوحِ زمانہ پر اس کی یادگار اب تک منقوش ہے۔ بقول غالبؔ۔ ؎

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

حضورؐ کی وفات کے بعد سلسلۂ تبلیغ رسالت ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ فریضہ امتِ محمدیہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ امتِ محمدیہ ہم مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ جو قوم بھی اس پیغام کی صداقت کو تسلیم کرکے اسے اپنا لیگی اس کا شمار امتِ محمدیہ میں ہو جائے گا، یعنی اس امت میں جسے کتابِ خداوندی کا وارث قرار دیا گیا تھا (۳۵/۳۲) آیئے دیکھیں رسول اللہ کے بعد، تبلیغِ رسالت کے بارے میں قرآنِ حکیم کا کیا ارشاد ہے۔ سورۃ الانعام میں آیا ہے:۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ۚ قُلِ اللّٰهُ ۙ
شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۙ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ
لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ (۶:۱۹)

"ان سے پوچھو کہ ان حقائق کی صداقت کے لئے (جنہیں میں بیان کرتا ہوں) کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟ میرے اور تمہارے درمیان خود اللہ کی شہادت موجود ہے۔ اسی کا فیصلہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ شہادت اور فیصلہ اس قرآن میں موجود ہے جو مجھے بذریعہ وحی دیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ (یعنی قرآن) بعد ازاں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دوں۔" (۱۸:۲۷)

اس آیت (۶:۱۹) میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ حضورؐ کی لسانِ مبارک سے کہا یہ گیا ہے کہ "میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے۔" لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ "تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی متنبہ کروں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد ازاں پہنچے"۔ یہ وضاحت طلب ہے۔ یاد رہے کہ قرآنِ حکیم تمام اقوامِ عالم کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطۂ راہنمائی ہے۔ حضورؐ نے اپنے مخاطبین کو تو اس سے بذاتِ خود آگاہ کر دیا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلۂ تبلیغِ رسالت ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے حضورؐ کی امت کی وساطت سے جاری رہنا تھا۔ قرآن کی یہ تبلیغ (لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ میں قابلِ غور ہے) قیامت تک جاری رہے گی۔ اسے حضورؐ ہی کی طرف سے سمجھا جائے گا۔

سورۃ الجمعہ (۶۲) میں اس کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ سورۃ الجمعہ کی آیات ۲ اور ۳ میں آیا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ
اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا
یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (۶۲:۲-۳)

"اللہ وہ ہے جس نے یہ رسولؐ ان لوگوں کی طرف بھیجا ہے جنہیں اس سے پہلے آسمانی کتاب نہیں ملی تھی۔ یہ رسولؐ ان کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے۔ پھر انہیں سمجھاتا ہے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایسا عملی پروگرام دیتا ہے جس سے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ چنانچہ

اس رسولؐ کی تبلیغ و تعلیم و تربیت سے، وہ قوم جو اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھی (زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہوگئی)۔"

اس سے اگلی آیت میں آیا ہے وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اس کا مفہوم یہ ہے کہ (اس رسولؐ کی رسالت اس کی اوّلین مخاطب قوم تک محدود نہیں) یہ اُن کی طرف بھی اسی طرح رسول ہے جو ان لوگوں کے بعد آنے والے ہیں۔ یعنی عالمگیر انسانیت کی طرف رسول اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے رسول۔ (یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے اس قرآن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس رسولؐ کا سلسلۂ رسالت اُس کی امت کی وساطت سے، قرآن کے ذریعے، ابد تک باقی رہے گا) یہ سب کچھ اللہ کے غلبہ وحکمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔"

غور فرمایا آپ نے، خواتین وحضرات کہ قرآنِ کریم نے اس سوال، جو دل میں اٹھتا ہے، کا جواب خود ہی دے دیا ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد تبلیغِ رسالت کی کیا صورت ہوگی؟ اس نے کہا کہ رسول، اللہ کی کتاب دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ اللہ کی آخری کتاب (القرآن) اپنی مکمل اور محفوظ شکل میں موجود ہے اس لئے اب کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ رہا اس کی تبلیغ کا فریضہ، سو اسے امتِ محمدیہؐ کے سپرد کردیا۔ فرمایا:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)

"رسولؐ کے بعد ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا جنہیں ہم نے اس مقصد کے لئے منتخب کیا تھا۔"

لہٰذا ختمِ نبوت کے بعد قرآنِ حکیم کے اقوامِ عالم (اور لوگوں) تک پہنچانے کا فریضہ امتِ مسلمہ (ہم لوگوں) نے ادا کرنا تھا۔ لیکن....... اور یہ لیکن بڑا اہم ہے، جس قوم نے خود ہی قرآن کو "مہجور" (۲۵:۳۰) بنا رکھا ہو وہ اسے دوسروں تک کیا پہنچائے گی۔ لہٰذا ہم دوسرے جرم کے مجرم ہیں۔ ایک خود ترکِ قرآن کے اور دوسرے اسے اقوامِ عالم تک پہنچانے کے فریضہ کی عدم ادائیگی کے۔ اور اس دوسرے جرم کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔ خود بھی عذاب میں مبتلا ہیں اور باقی اقوامِ عالم بھی زندگی کی کشمکش میں مبتلا۔ یاد رکھیں کہ جو قوم بھی قرآن کو اپنا راہنما بنا کر اسے دوسروں تک پہنچائے گی، وہی فریضۂ تبلیغِ رسالت ادا کرے گی۔ رسولُ اللہ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہی تلقین کی تھی۔ رسولُ اللہ کے اس فرمان کی یاد دہانی بھی اتنی ہی ضروری

ہے۔ سنیئے

فریضہ کی یاد دہانی اُسوۂ رسولِ اعظمؐ کی روشنی میں

حضورؐ نبی اکرمؐ اپنے پہلے اور آخری حج (جسے عرفِ عام میں حجۃ الوداع کہتے ہیں) کے لئے میدانِ عرفات میں تشریف لاتے ہیں۔ خطبۂ حجۃ الوداع کے بعد حضورؐ مجمع پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں۔ قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم اس شمعِ نبوت کے گرد جمع تھا۔ حضورؐ ان سے یہ کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں کہ "تم سے اللہ کے ہاں میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کہو تم کیا جواب دو گے؟" "کیوں؟ میں نے پیغامِ خداوندی تم تک پہنچا دیا۔" اس سوال سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پیغامِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچانا آپؐ کی نظر میں کتنا اہم تھا۔ احساسِ ذمہ داری کا جذبہ کتنا شدید تھا۔ اس اُسوۂ حسنہ میں ہمارے لئے سبق ہے۔ اگر ہم سوچیں تو رسول اللہؐ کے سوال کے جواب میں لاکھوں زبانیں ایک ہی وقت میں پکار اٹھیں کہ "ہاں، آپؐ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا ہے۔" کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت جو کسی انسان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد میسر آجائے۔ حضورؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔ "اے اللہ! گواہ رہنا۔" اس کے بعد پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اس پیغامِ خداوندی کو ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔" یہ فرما کر اس پیغامِ خداوندی کی وسعتوں کو ابدیت سے ہم کنار کر دیا!

رسول اللہؐ کے فرمان کا مفہوم یہی ہے کہ ان کے بعد قرآنِ حکیم کی تبلیغ امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری۔ یہی منشائے خداوندی ہے (۳۵:۳۲)۔ اب ہم نے قرآنِ حکیم کی تبلیغ کو اس کے منطقی نتیجہ تک لے جانا ہے تاکہ اس نظامِ خداوندی کے دوبارہ قیام کی کوئی صورت نکلے جس کے لئے حضورؐ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ رسول اللہؐ والذین معہٗ نے تو اپنے وقت میں قرآنی نظام قائم کر کے دکھا دیا کہ یہ ممکن العمل ہے۔ اب ہم نے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹:۳۳) کا عملی مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ ہے خواتین و حضرات ہماری منزل۔ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵:۶۷)۔ کا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ ہم نے قرآن کی تبلیغ کے لئے لوگوں میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنی ہو گی کہ وہ سوچنے لگ جائیں کہ ایک اسلام تو وہ تھا جسے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ نے پیش کیا تھا جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جس سے ہمارا (مسلمانانِ عالم کا) شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے، جب کہ وہ اسلام جس نے اس وقت ہمیں سرفرازیاں عطا کی تھیں ہمارے پاس آج بھی اللہ کی زندہ و پائندہ کتاب "القرآن" میں محفوظ

ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم آج تک وہ نظامِ خداوندی کہیں بھی قائم نہیں کر سکے جیسا رسول اللہؐ نے مدینہ میں قائم فرمایا تھا۔ ہمیں انہیں بتانا ہوگا کہ ہمارا موجودہ اسلام، منزل من اللہ دین نہیں ہے بلکہ انسانوں کا خودساختہ مذہب ہے اور مذہب کوئی بھی ہو اس میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ تبلیغ کے ذریعہ ہم نے ہمارے مروجہ مذہب کو پھر سے دین میں بدلنا ہوگا۔ سفر بڑا کٹھن ہے "مگر یقینِ سحر ہے جنہیں، اداس نہیں"

خواتین وحضرات! اسے ایک بار سُن لیجئے کہ ہمارا فریضہ کیا ہے؟ ہم نے رسول اللہؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قرآنِ حکیم کا پیغام لوگوں تک بطریقِ احسن پہنچانا ہے تاکہ لوگوں کے قلب ونظر میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جس کا قرآن تقاضا کراتا ہے (۱۱:۱۳) اور جس کے بغیر قرآنی معاشرہ کی تشکیل ممکن نہیں اسے ممکن بنانا ہمارا فریضہ ہے اور یہی "ادارہ طلوعِ اسلام" کا فریضہ۔ یعنی تبلیغِ قرآن کے ذریعے قرآنی معاشرہ کا قیام۔

ادارۂ طلوعِ اسلام کا فریضہ

اس فریضہ کے حصول کے لئے ہمارے استادِ مکرمؒ نے "تحریکِ طلوعِ اسلام" کی بنا ڈالی تھی۔ ادارۂ طلوعِ اسلام اس کا سب سے اہم اور بڑا ستون ہے لیکن ہمارا تغافل تو دیکھئے کہ پچھلے آٹھ سالوں سے یہ "اہم ستون" بغیر سربراہ اور بغیر مناسب مالی وسائل کے وقت کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ ناظم ادارہ جناب محمد لطیف چوہدری صاحب، ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کسی نہ کسی طریقے سے ادارہ کو سنبھالے رکھا اور "طلوعِ اسلام" شائع ہوتا رہا۔ اب جبکہ سربراہ کا تقرر ہو چکا ہے ہمیں ایک پلان کے تحت، منظم طریقہ سے، آگے بڑھنا چاہیئے۔ ہماری اس جدوجہد کا نشان (MOTTO) "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ" ہوگا جو ہمیں ہر وقت یاد دلاتا رہے گا کہ ہمارا فریضہ کیا ہے۔ اپنے فریضہ سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میرے سامنے ایک جامع اور مربوط پلان ہے جس کا خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی آراء کی روشنی میں اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کہتا چلوں کہ میں ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا، نہ میں ان عوامل کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے ماضی میں ہمارے سعی و عمل میں سُست روی کا رجحان پیدا ہوا۔ ہمیں ماضی میں الجھے بغیر آج کی فکر کرنی چاہیئے تاکہ ہمارا کل بہتر ہو سکے۔

آئیے تبلیغی پروگرام کے خاکہ پر ایک نظر ڈالیں۔

تبلیغی پروگرام کا خاکہ

ہمارا مقصد قرآنی تعلیم کی تبلیغ ہے یعنی اس فکر کو پہلے خود سمجھنا اور خود سمجھنے کے بعد اسے دوسروں تک پہنچانا ــــ قلم اور زبان کے ذریعے اور معاملات میں حسن و کردار کے ذریعے اِس کی صداقت کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اِس کے لئے استادِ محترمؒ کے الفاظ میں ہمارا طریق وہی ہونا چاہیئے جو ملّتِ اسلامیہ کے موسّس حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس وقت ملا جب آپ نے قوم کی حالت سے متأثر ہو کر بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کیا۔ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ط (پروردگار! مجھے بتا کہ اس قسم کی بے حس اور مردہ قوم کس طرح از سرِ نو زندہ ہوگی ؟)۔ وہ طریق کیا تھا ؟ فرمایا۔ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ــ (یعنی اس طریق کو سمجھنے کے لئے یوں کرو کہ تم چار پرندے لو۔ وہ شروع میں تم سے دور بھاگیں گے۔ انہیں اس طرح آہستہ آہستہ سدھاؤ کہ وہ تم سے مانوس ہو جائیں) آخر الامر ان کی یہ حالت ہو جائے گی کہ اگر تم انہیں الگ الگ مختلف پہاڑیوں پر چھوڑ دو اور:۔
ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ط (۲:۲۶۰)۔ (اور پھر انہیں آواز دو تو وہ آپ کی آواز پر اڑتے آپ کی طرف آجائیں گے۔ یہ ہے وہ فارمولا جس کی تبلیغ کے دوران آپ کو ضرورت ہوگی کیونکہ تبلیغی پروگرام میں علم و عقل کی ضرورت ہے۔ اس میں ہنگامہ آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ قرآن کا پیغام یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے قریب حسنِ سیرت سے لاؤ اور نظامِ خداوندی سے اچھی طرح مانوس کراؤ۔ یہ نظام اپنے اندر اتنی قوت اور حکمت رکھتا ہے کہ اسے چھوڑ کر یہ کہیں نہیں جاسکیں گے۔ قرآنی تعلیم کی روشنی میں ہم نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ندی کی سی روانی اور چٹان کی سی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہی ہمارا پروگرام ہے اور اسی پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔ تبلیغ کے ذرائع میں عند الضرورت تبدیلی کی جاسکے گی لیکن کسی کی بے تابیٔ تمنّا کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمارے پروگرام میں ہنگامہ آرائی کا دخل کبھی نہیں ہوگا۔

اس پروگرام کو رواں دواں رکھنے کے لئے جن باتوں پر توجہ کی فوری ضرورت ہے ان میں سرِ فہرست ادارہ کے دستور پر نظرِ ثانی، مستقل اور یقینی وسائلِ زر کی فراہمی، مرکز کی تشکیلِ نو، ۱۹۹۴ء کے لئے تبلیغی پروگرام کی ترتیب و منظوری اور مبلّغین اور معلّمین کی ایک ہمہ صفت جماعت کی تیاری وغیرہ ہیں۔ دستور کے بارے میں کہتا چلوں کہ اس میں دو بڑی تبدیلیاں زیرِ غور ہیں۔ پہلی تو طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک" کو دستور کا حصہ بنانے کے متعلق ہے اور دوسری چیئرمین کے الیکشن اور فرائض کے بارے میں ہے۔ یاد رہے کہ یہ ادارہ کے سربراہ

کی ذمّہ داری ہے کہ آپ کے منظور شدہ پروگراموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ اس کے لئے اسے دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے، کام کرنے کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔

وسائل کی یقین دہانی کے بعد پروگرام کا آغاز "پمفلیٹرنگ" کے نظام کو ازسرِ نو بحال کرنے سے ہوگا۔ پروگرام اس طرح ترتیب دیا جائے گا کہ کم از کم ایک درجن موضوعات بشمول "طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک" پر پمفلٹس (PAMPHLETS) ہمہ وقت بزموں کے پاس موجود رہیں، جنہیں وہ اپنے یہاں مقامی اجتماعات میں نتائج کی پرواکئے بغیر، خاموشی سے تقسیم کرتی چلی جائیں گی۔ اس سے ان کے ہاں فکر متحرک ہوگی، اعتراضات اور سوالات ابھریں گے۔ ایسے حالات اگر پیدا ہوں تو یہ بزم کی کارکردگی اور اُس علاقے میں ایسے لوگوں کی موجودگی کا ثبوت ہوگی جو زندگی کے عملی مسائل پر غور اور علم و بصیرت کی رُو سے، انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزو مند ہیں۔ ایسے لوگوں کی مزید تعلیم کے لئے وہ بزم گروپ ڈسکشن اور منی کنونشن کا اہتمام کرے گی جس کے انتظامات میں ادارہ مدد کرے گا۔ اس سلسلے کو مؤثر طریق پر آگے بڑھانے کی ذمّہ داری چیئرمین کے سر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس ذمّہ داری کو احسن طریق سے نبھانے کے لئے اسے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔

بزموں کی کارکردگی اور ان کی ضروریات جاننے کے لئے بزموں سے مسلسل رابطہ رکھا جائے گا۔ اس کے لئے ناظمِ ادارہ کو اضافی ذمّہ داریوں سے فارغ کیا جا رہا ہے۔ تبلیغی پروگرام کو ترتیب دینے اور انہیں کامیابی سے چلانے کے لئے، چیئرمین کی مدد کے لئے، ایک یا دو وائس چیئرمین کا تقرر بھی زیرِ غور ہے۔ وائس چیئرمین اور ناظم ادارہ کی تبلیغی ٹیم کا ملک کے اندر اور باہر دورہ کرنے کا پروگرام بھی زیرِ غور ہے۔ تبلیغی پروگرام کا دوسرا حصہ نمائندگانِ بزم کی تربیت اور تبلیغی پروگرام کا میدان وسیع کرنے سے متعلق ہے۔ تربیتی پروگرام کے لئے وسائل کی فراہمی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے اگلے سال تک مؤخر کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں تک تبلیغ کا رُخ بدلنے اور اسے INWARD سے OUTWARD بنانے کا تعلق ہے اسے فوری طور پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے پمفلٹس کے موضوعات کا انتخاب پہلے سال اس انداز سے کیا جائے گا کہ پمفلٹس مسجدوں میں بھی بلاخوفِ مخالفت تقسیم کئے جا سکیں۔ تبلیغی اجتماعات بشمول سالانہ کنونشن ایسی جگہوں پر منعقد کی جائیں جہاں عام آدمی کو آنے میں کوئی جھجک نہ ہو۔ نیز ان اجتماعات میں خطاب کی دعوت طلباء اور طالبات کے علاوہ ایسے روشن خیال افراد کو بھی دی جائے جو بے شک تحریک سے متعلق نہ ہوں ــــ مقصد اس فاصلے کو کم کرنا ہے جو بدقسمتی سے ہمارے اور عامۃ الناس کے درمیان حائل ہے۔ میری ان معروضات سے یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ میں، تحریک کے مقصد و مسلک یا اپنے محسن و مربّی علامہ غلام احمد پرویز کی پیش کردہ

قرآنی فکر میں کسی تبدیلی کا خواہشمند ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ عوام تک رسائی کی ہماری مخلصانہ کوشش ہوگی جس میں ایک طرف ہماری آواز وسعت پذیر ہوگی اور دوسری طرف عوام کو اپنے قریب لانے کا موقعہ ملے گا۔ اس سمت میں بزمِ کویت، کراچی اور ناروے پہلے ہی قدم بڑھا چکی ہیں جن کی کارکردگی دوسری بزموں کے لئے نشانِ راہ ثابت ہو سکی ہے۔

تبلیغی پروگرام کے سلسلہ میں یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ ملک بھر میں میٹرک، ایف۔اے، بی۔ اے اور ایم۔اے کے امتحانات میں اوّل آنے والے طلبا اور طالبات میں نقد انعامات اور کتب کے تحائف تقسیم کئے جائیں، جسے بعد میں دوئم اور سوئم آنے والوں تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ مقامی اجتماعات اور سالانہ کنونشن میں طلبا کے مقابلوں کا اضافہ کر کے، قرآنی فکر کو ان تک پہنچانے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے ان سب پروگراموں کو روبعمل لانے کے لئے، فراہمیٔ زر کے علاوہ، مرکزی دفتر میں ایسے لوگوں کا تقرر بھی ضروری ہے جو ان امور کی سرانجام دہی میں مدد دے سکیں۔ آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ تحریک کے پاس ایک جامع اور خودکار نظام ہونا چاہیئے تاکہ کسی ایک فرد کی کم کوشی یا علیحدگی سے تحریک کی پرواز میں کوتاہی نہ آنے پائے۔ اس کے ساتھ دانشوروں کی ایک ایسی ٹیم کی بھی ضرورت ہے جو قرآنِ حکیم میں ریسرچ کرے۔ ایسے مضامین لکھے جس سے نوعِ انسان کی مشکلات کا حل، جو قرآن پیش کرتا ہے، سامنے آسکے، تبلیغِ قرآن کے لئے مبلغین کی جماعت تیار کرے اور چیئرمین کو قرآنی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے تجاویز اور مشورے دے۔ دانشوران کی یہ ٹیم مرکز کا ایک مستقل حصّہ ہوگی۔ مرکز کے دفتری نظام کا بھی ایک ڈھانچہ ترتیب دیا گیا ہے جو وسائل اور ضروریات کے تحت قدم بقدم مکمل ہوتا رہے گا۔ ناظم ادارہ اس پر روشنی ڈالیں گے۔

تحریک کا ترجمان، ہماری آواز، ماہنامہ "طلوعِ اسلام" آپ کی فوری توجّہ چاہتا ہے۔ ہم دن اور رات کوشاں ہیں کہ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے۔ اس کے موجودہ معیار سے میں مطمئن ہوں۔ اگر آپ کو کوئی کمی نظر آتی ہے تو برائے مہربانی ایک "معیاری" مضمون لکھ بھیجئے تاکہ معیار بلند کرنے میں مدد مل سکے۔ اس کی سرکولیشن بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ ہم اسی طرح ہاتھ پھیلاتے رہیں گے اور چندہ کے لئے اپیلیں کرتے رہیں گے جیسی اب کی ہے۔ مجھے بتایئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ باعزت طریقہ واضح ہے۔ اسی لئے اگلے تین سالوں میں اس کی سرکولیشن دس ہزار تک بڑھانے کا پروگرام ہے۔ جب ہمیں اپنے ادارہ کے مقصد و مسلک پر یقین ہے، تو پھر "طلوعِ اسلام" کے خریداروں کی تعداد بڑھ کیوں نہیں سکتی۔ اس کے لئے بزموں کو بقول شخصے "جمود" سے نکلنا ہوگا۔ ہمیں اپنے فریضہ کو پہچاننا ہوگا اور اس کے حصول کے لئے

باہر نکلنا ہوگا۔ صرف باتوں اور مشوروں سے کام نہیں چلے گا۔ عمل کی ضرورت ہے۔ سرکولیشن بڑھانے کے لئے شروع شروع میں ہمیں کم ازکم دو یا تین ماہ "طلوعِ اسلام" مفت بانٹنا پڑے گا۔ خرچہ ادارہ برداشت کرے گا۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے ممبرانِ بزم کے ذریعے ایسے پڑھے لکھے عزیزو رشتہ دار، دوست و احباب، اڑوس پڑوس اور محلہ دار میں طلوعِ اسلام تقسیم کریں جن سے خریدار بننے کی توقع کی جا سکتی۔ ناظم ادارہ اس اسکیم پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

خلاصۂ گفت گو

خواتین و حضرات! تبلیغی پروگرام جس کا میں نے مختصراً ذکر کیا ہے، کی ترتیب یوں ہوگی۔

(۱) پمفلٹس کی تقسیم بذریعہ بزمہائے طلوعِ اسلام۔
(۲) سنہ ۱۹۹۴ء میں کم ازکم دو یا تین منی کنونشن (ایک روزہ)۔
(نوٹ: کراچی، فیصل آباد اور پشاور، حالات اجازت دیں تو پہل کر سکتی ہیں)۔
(۳) سالانہ کنونشن (اکتوبر سنہ ۹۴ء کے آخری ہفتہ میں) کسی پبلک ہال میں، دو دن کے لئے، موضوعات کا انتخاب، طلبا اور دانشوران کی بھرپور شمولیت کے ساتھ۔
(۴) دفتری عملہ کی تقرری، مجلسِ ادارت کی تنظیمِ نو، نئے خریدار بنانے کی مہم۔
(۵) ماہنامہ "طلوعِ اسلام" کے جمالیاتی اور علمی معیار پر مزید توجہ۔
(۶) غیر ملکی بزموں کی گروپنگ کر کے تبلیغی اجتماعات کا انعقاد۔ ادارہ کی شمولیت۔
(۷) قرآنک ریسرچ سنٹر کی تعمیر میں ادارہ کی شمولیت۔
(۸) پبلسٹی سیل (PUBLICITY CELL) کا قیام۔
(۹) اوّل آنے والے طلباء میں انعامات تقسیم کرنے کا پروگرام۔
(۱۰) طلبا و طالبات میں مقابلہ مضمون نویسی۔

یہ سن لیجئے کہ جس پروگرام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس کی کامیابی کا انحصار مستقل اور یقینی مالی وسائل اور ہماری صفوں میں مکمل اتحاد اور نظم و ضبط پر ہے۔ اگر آپ نے ادارہ کے ساتھ کھلے ذہن اور خلوص سے تعاون کیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی منزل کی طرف رواں دواں نہ ہو سکیں۔ یاد رہے کہ ہم سے کبھی ہمارے فریضہ کی ادائیگی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر ہم تبلیغ نہیں کریں گے تو ہماری گواہی کون دے گا؟ میری تو ہر دم یہی دعا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸:۱۰)

...ے میرے رب! تو ایسا انتظام کردے کہ ہمیں تیری طرف سے سامانِ زندگی بھی بہم پہنچتا رہے اور ہم نے جس ...کا ارادہ کیا ہے اسے کامیاب بنانے کے لئے اسباب و ذرائع بھی میسر آجائیں۔" آمین۔

...میں آپ، خواتین و حضرات کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری معروضات کو توجہ سے سُنا۔ آپ کی اجازت ...ے آخر میں، آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں قرآنی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد بڑی حد تک ...ن سعی و عمل سے وابستہ ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس وقت قرآنی فکر کی یہ آواز ہمارے اس مختصر حلقے ...ے سوا اور کہیں سے باقاعدگی سے نہیں اُٹھ رہی۔ اس لئے سوچ لیجئے کہ اگر ہماری کوتاہی یا لغزش کی وجہ ...ے یہ آواز دب کر رہ گئی یا اسے اس تندہی سے نہ اٹھایا جیسا کہ اس کا حق ہے، تو فطرت کی عدالت میں ...ا یہ جرم کس قدر سنگین اور اس کی تعزیر کس قدر سخت ہوگی۔ لہٰذا، میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ ...ب وقت کی اس آواز کو پہچانیں اور قرآنی فکر کو عام کرکے اپنے فریضہ کی تکمیل کے لئے جو کچھ بن پڑے ...دریں۔ چہ عجب کہ آپ کی ان کوششوں سے ابنِ آدم کو وہ فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے جس کی ...ش میں وہ یوں مارا مارا پھر رہا ہے۔

والسلام علیکم

وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ۔ (۱۱:۸۸)

"میرے پیشِ نظر مقصد کے مطابق اسباب کا مل جانا قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کے قانون کی محکمیت پر مجھے پورا پورا بھروسہ ہے اور سفرِ حیات میں میرا ہر قدم اسی چشمۂ خیر و خوبی کی طرف اٹھتا ہے۔"

جوانی میں ایسی ہر بات سے بچو جو تمھاری بدنامی کا باعث ہو تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمھارا ماضی تمھارے لئے وجۂ ندامت نہ ہو۔ —— حضرت عمرؓ

ایم بشیر احمد

اَلحَمدُ لِلّٰہِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ قرآنِ کریم کی ایک رفیع الشان اصطلاح ہے۔ الحمد للہ کا پڑھنا مسلمین اور مومنین کے شعار میں داخل ہے جب کبھی اور جہاں کہیں ہمیں اللہ کی طرف سے کوئی نصیحت ملتی ہے یا کسی طرح کا ہم پر فضل و انعام ہوتا ہے تو ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ الحمد للہ۔

آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم نے اس بارے میں ہماری کیا کچھ راہ نمائی کی ہے اور وہ کون کون سے اہم مواقع ہیں جہاں ہم کو واقعی الحمد للہ کہنا لازم ہے۔

(۱) قرآنِ مجید کی پہلی سورہ، سورۃ الفاتحہ کی ابتدا ہی یوں ہوتی ہے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝

ہر قسم حمد و توصیف اور شکر و امتنان اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے جو الرحمٰن بھی ہے اور رحمٰن بھی اور وہی مالکِ یوم الدّین بھی ہے۔

اللہ رحمٰن ہے کہ اس نے ہمارے لئے بلکہ اپنی تمام مخلوق کے لئے وہ سامانِ نشوونما اور وسائلِ حیات جو ہم اپنی کوشش اور محنت سے قطعاً حاصل نہیں کر سکتے تھے ہمارے لئے وافر مقدار میں مہیا کر دیئے جو ہر کسی کو بہ سہولت بغیر کسی محنت اور مشقت کے حاصل ہیں۔ جیسے ہوا، روشنی، حرارت، پانی وغیرہ۔

اللہ رحیم ہے کہ وہ ہماری ہر سعی و محنت کا خوب قدردان ہے اور اپنی رحمت سے ہماری تمام کوششوں کا خوب صلہ دیتا ہے۔ بس انسان ایک دفعہ کسی کام کے لئے صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے کوشش شروع کر دے، تو اللہ کی رحمتیں اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہیں اور ہر کوشش بار آور ہوتی جاتی ہے اور ہر کام بخیر و خوبی انجام پاتا جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ دنیا میدانِ عمل ہے۔ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت پڑ سکتی تھی وہ اللہ نے اس کی تخلیق سے قبل ہی پیدا فرما دیئے۔

وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ
اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (۱۴/۳۴)
جو کچھ تم لوگوں نے مانگا (یعنی جو کچھ بھی تمہاری ضروریاتِ زندگی کا تقاضا تھا) وہ سب کا سب اللہ نے مہیا کر دیا۔ اور (یہ سامان اس قدر وافر اور کثرت میں ہے کہ) اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کبھی ایسا نہ کر سکو.... مگر (یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ انسان (اکثر و بیشتر) بہت بڑا ظالم اور بہت بڑا ناشکرا ثابت ہوتا ہے۔

اس لئے اللہ نے فرمایا کہ وہ ربّ العالمین اور الرحمٰن الرحیم ہونے کے ساتھ ساتھ مالکِ یوم الدین بھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ان کی موت کے بعد ایک خاص دن (یوم الدین۔ یوم القیامۃ کو) جمع کرے گا اور ان سب سے اپنی عطا کردہ نعمتوں کا حساب کتاب لے گا کہ کس کس نے ان کا صحیح استعمال کیا اور کس کس نے ظلم اور کفر کی بنا پر ان کا غلط اور ناجائز استعمال کیا اور اسی کے مطابق وہ فیصلہ کرے گا اور انسان کو جزا و سزا دے گا۔

اب نمبروار قرآنِ کریم کے ان مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں جہاں جہاں یہ اصطلاح الحمدللہ استعمال ہوئی ہے۔ اور دیکھتے ہیں کہ تمام مقامات کا مطالعہ کرنے سے ہم پر اللہ کے کن کن احسانات اور نوازشات کا تذکرہ ہے اور کیا ہم واقعی اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا کماحقہٗ شکر بجالاتے ہیں اور الحمدللہ کہتے ہیں اور ان الفاظ کا واقعی حق ادا کرتے ہیں۔

(۲) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝ (۶/۱)
ساری کی ساری حمد اور تعریف و توصیف اور شکرگزاری تو صرف اللہ واحد کے لئے ہونا چاہیئے کہ جس ذاتِ ستودہ صفات نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ظلمات و نور (اندھیروں اور روشنی) کا نظام قائم فرمایا۔ اس کے باوجود لوگ کفر و انکار اور ناشکری کا وطیرہ اختیار کر لیتے ہیں وہ اپنے اس عظیم الشان رب کے ساتھ اس کے ہم پلہ اور شریک بنا لیتے ہیں۔

(۳) وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ..... لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْ لَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ..... وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا..... اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ اَلْحَمْدُ

لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۴۵-۴۲/۶)

اے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم نے یقیناً آپ سے قبل بھی بہت سی امتوں کی طرف رسول بھیجے (اور ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اکثر) ہم نے ان کو سختیوں اور تکلیفوں میں بھی پکڑا کہ شاید (اس طرح سے) وہ عاجزی کر لیں (اور اپنی نافرمانی سے باز آجائیں)۔ (۶/۴۲)

مگر جب ان پر ہمارا عذاب اور سختی آئی تو آخر ان لوگوں نے عاجزی اور انکساری اظہار کیوں نہ کیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے دل ہی سخت (پتھر) ہو گئے تھے اور شیطان نے ان کے اعمال کو (ان کی نظروں میں) بڑا مزین، خوشنما اور آراستہ کرکے دکھایا۔ (۶/۴۳)

تو بالآخر جب ان لوگوں نے اس تذکیر و نصیحت کو جو کی گئی فراموش کر دیا، تو ہم نے ان پر (وقتی طور پر محض ان کی آزمائش کے لئے) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے (ان کو بڑی خوشحالی اور سہولت دے دی) یہاں تک کہ وہ ان وقتی اور آزمائشی خوشحالیوں میں عطا کردہ آسائشوں اور سامانِ راحت و عیش میں بالکل مگن اور شاداں و فرحاں ہو گئے تو پھر ہم نے ناگہاں ان کو پکڑ لیا (ان کا مواخذہ کر لیا) اور اس وقت وہ (ہر قسم کی خیر و فلاح اور حمد و نصرت سے) مایوس اور ناامید ہو کر رہ گئے۔ (۶/۴۴)

اور یوں ان ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ کے رکھ دی گئی اور ان ظالموں کے اس بھیانک انجام پر اللہ کی مخلوق پکار اٹھی کہ

الحمد للہ رب العالمین (حمد و تعریف اور شکر و سپاس ہو رب العالمین کا جس نے ان ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ کر اللہ کی مخلوق کو ان سے شر سے محفوظ کر دیا)

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ...... وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ ...... تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۴۲-۴۳)

جو لوگ صدقِ دل سے ایمان لے آئے اور (اس ایمان کے تقاضوں کے عین مطابق) ایمانِ صالح بجا لائے (ہمارا قانون یہ ہے کہ عملِ صالح کے معاملہ میں) کسی شخص کو اس

کی وسعت (کار) سے بڑھ کر مکلّف کرتے ہی نہیں (بس ہم چاہتے یہ ہیں کہ ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق جس قدر آسانی سے ہوسکے اصلاح کے کام کرتا رہے) تو ایسے ہی لوگ اصحاب الجنۃ ہوتے ہیں اور یہ لوگ اس جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ (۷/۴۲)

اور (جب یہ لوگ جنت میں داخل کردیئے جائیں گے تو) ہم ان کے سینوں (دلوں) میں سے ساری کدورتیں اور نفرتیں کھینچ باہر کریں گے۔ جنت میں ان کے تحت نہریں جاری ہوں گی اور (اس وقت) وہ (سرشار ہوکر) پکار اٹھیں گے۔۔۔ الحمد للہ " حمد وشکر ہے اس اللہ کا کہ جس نے ہمیں اس (نیک انجام) کی ہدایت فرمادی۔ ورنہ اگر اللہ ہمیں ہدایت (کی توفیق) نہ دیتا تو ہم (از خود تو) ہدایت یاب نہ ہوسکتے تھے۔

ہمارے پاس اللہ کے جو رسول (ہدایت لے کر آئے تھے وہ) واقعی حق لیکر آئے تھے۔

اور اس وقت (ان خوش بخت لوگوں کے درمیان) منادی کردی جائے گی کہ یہ جنّت جس کے تم وارث بن چکے ہو یہ تمہیں تمہارے ان اعمال کے عوض دی گئی ہے جو تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔ (۷/۴۳)

(۵) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا .... فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ .... وَ اٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۱۰/۹-۱۰)

جو لوگ واقعی صدقِ دل سے ایمان لے آئے اور (ایمان کے تقاضوں کے عین مطابق) اعمالِ صلاح وفلاح کرتے رہے تو ان کا ربّ ان کے اس ایمان (اور عمل) کی بنا پر ان کو جناتِ نعیم (نعمتوں بھرے باغوں) کی طرف رہنمائی کردے گا کہ جہاں ان کے تحت انہار جاری ہونگی۔ (۱۰/۹)۔

ان باغوں میں ان کی دعا اور پکار بس یہی ہوگی کہ سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ اور ان کی آپس میں علیک سلیک بھی سلام ہی سے ہوگی اور سب سے آخری دعا اور پکار ان کی بس یہی ہوگی کہ " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " (ساری حمد وتوصیف

اور شکر و سپاس گزاری تو صرف اللہ ربّ العالمین ہی کے لئے ہے کہ جس نے ہم کو ان نعمت بھرے باغوں میں داخل فرمایا)۔

(۶) رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ .... وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُوْنَ ○ رَبَّنَا اِنَّکَ تَعْلَمُ .... وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ○

(۱۴/۳۷ — ۳۹)

۳۷۔ جناب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ربّ کے حضور عرض کیا کہ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کا ایک حصّہ تیرے بیتِ حرم (خانہ کعبہ جو اللہ کا احترام والا گھر ہے) کے نزدیک وادیٔ غیر ذی زرع (ایسی وادی جس میں کوئی زراعت وغیرہ نہیں ہوتی) میں لاکر سکونت پذیر کردی ہے۔ اے ہمارے ربّ! (یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ) تاکہ یہ لوگ اقامتِ صلوٰۃ کریں۔ (صلوٰۃ کا نظام قائم کریں)۔ پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے (کہ وہ ان کی مدد و اعانت کے لئے تیار ہو جائیں) اور ان کو میوہ جات کی روزی عطا فرما کہ یہ لوگ شکر گزار بن جائیں۔

۳۸۔ اے ہمارے ربّ! تو خوب جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں یا اعلانًا کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہوتی۔ نہ زمین کی (کوئی چیز) اور نہ آسمان کی۔

۳۹۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہ جس نے مجھے بڑی عمر (بڑھاپے) میں اسماعیل اور اسحٰق (جیسے فرزند) عطا کئے۔ میرا ربّ تو واقعی سمیع الدعا ہے (وہ یقینًا دعا کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ (میں نے دعا مانگی تھی کہ اے میرے ربّ! مجھے صالح اولاد عنایت کر۔ وَهَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (۳۷/۱۰۰) اور اس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود مجھے اولاد دے دی جبکہ میری بیوی بھی بوڑھی اور بانجھ تھی۔

(۷) ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ○ هَلْ یَسْتَوٗنَ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ○ بَلْ اَکْثَرُهُمْ

لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۞ (۱۶/۷۵)

اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے۔ (اس کا تقابل ۲۹/۳۹ سے کریں۔ ایک عبدِ مملوک (دوسرے کا غلام) ہے اس کو کسی چیز پر بھی کچھ قدرت اور (اختیار) حاصل نہیں ہے۔ (اس کے برعکس) ایک اور شخص ہے کہ جس کو ہم نے اپنی جناب سے رزقِ حسن عطا کر رکھا ہے۔ وہ اس رزق میں سے (رات دن) پوشیدہ اور ظاہر طور پر (اللہ کی راہ) میں خرچ کرتا رہتا ہے کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں (بالکل نہیں)۔ اور یہ مثال ایسی واضح ہے کہ ہر شخص کو بآسانی نظر آسکتی ہے تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ (اللہ ہی تمام تر حمد و توصیف اور شکر و سپاس کا سزاوار ہے کہ جو آئی واضح اور آسان فہم مثالوں سے بات سمجھا دیتا ہے۔ اللہ سے رشتہ توڑ کر انسان دوسری لایعنی ہستیوں کا غلام بن جاتا ہے مگر اللہ واحد کی عبدیت میں آنے والا شخص آزاد ہوتا ہے اور اللہ کے نظامِ ربوبیت کو مشہود کرنے میں ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے)۔

مگر اکثر لوگ (اس قسم کی بدیہی اور واضح بات بھی) نہیں سمجھ سکتے۔

(۸) قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ ...... ۞ وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ کَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا ۞

(۱۷/۱۱۰—۱۱۱)

۱۱۰۔ آپ ان لوگوں سے فرما دیں کہ تم لوگ اللہ کو چاہے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس بھی نام سے چاہے پکارو اس کے تو سارے نام ہی حسین ہیں۔

اور آپ اپنی صلوٰۃ میں آواز نہ زیادہ بلند رکھیں اور نہ ہی زیادہ پست بلکہ ان دونوں (انتہاؤں) کے مابین ایک درمیانی راستہ اختیار کریں۔

۱۱۱۔ اور اصل بات جس کا اعلان آپ کو خصوصی طور پر کہہ دینا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آپ فرما دیں۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ

(سب تعریف و توصیف اور شکرگزاری صرف اللہ واحد لاشریک کے لئے وقف ہے)

کہ جس نے نہ تو کسی کو اپنا ولد (بیٹا) قرار دیا ہے اور نہ ہی اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہی وہ عاجز اور ناتواں ہے کہ کوئی اللہ کا ولی اور مددگار ہونا چاہیئے (وہ ہر قسم کے شرک اور کمزوری سے پاک اور منزہ ہے)۔

آپ کا کام تو یہ ہے کہ آپ مسلسل اس کی کبریائی کا غلغلہ بلند کرتے رہیں (اور قولاً وفعلاً یہ ثابت کردیں کہ اللہ سب سے بلند و بالا اور اعظم و اکبر ہے۔ اَللّٰہُ اکبر وَ اعظم۔

(9) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ یَجْعَلْ
لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ
یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا
حَسَنًا ۝ مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۝ وَّ یُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا
اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ
لَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ
یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ (18/1-5)

(10) قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ
الْفُلْكَ .... وَ لَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ
مُّغْرَقُوْنَ ۝ .... فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ .... وَ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝ اِنَّ
فِیْ ذٰلِكَ الْكِتٰبِ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ۝ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ
بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ۝ (23/26-31)

قصہ بیان ہو رہا ہے جناب نوح علیہ السلام کا۔ بڑا ہی سبق آموز اور عبرتناک قصہ ہے۔ ہم صرف چند آیات کا مفہوم پیش کرتے ہیں۔

۲۶۔ (جناب نوح علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں) عرض کیا کہ اے میرے رب! ان لوگوں نے چونکہ مجھے جھٹلا دیا ہے اس لئے تو میری نصرت فرما۔

۲۷۔ تو ہم نے ان کی طرف (نوح علیہ السلام کی طرف) وحی کر دی کہ ہمارے زیر نظر ہمارے حکم اور وحی کے مطابق آپ ایک کشتی تیار کرلیں۔

جب ہمارا حکم آجائے اور تنور (پانی کے زور سے) جوش مارنے (اور ابلنے) لگے تو
سب حیوانات کے جوڑے جوڑے دو دو کشتی میں بٹھالو اور اپنے اہل (گھر والوں) کو بھی
سوا ان کے جن کی نسبت ان میں سے (ہلاک ہونے والوں) کا حکم (قول) صادر ہو چکا۔
...... اور ایسے ظالموں کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا۔ یہ یقیناً غرق ہو کر رہیں گے۔

۲۸۔ پھر جب آپ اور آپ کے ساتھ کشتی میں (نہایت متوازن طور پر) بیٹھ جاؤ تو اس وقت
کہنا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (تمام حمد و تعریف اور شکر و سپاس اس اللہ کے
لئے واجب ہے) جس نے ہم کو ان ظالموں کی قوم سے نجات بخشی۔

۲۹۔ اور اس وقت یہ دعا بھی کرنا کہ اے میرے رب مجھ کو ایسی جگہ اتاریو جو بابرکت ہو
اور تو واقعی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔

۳۰۔ اس (واقعہ) میں یقیناً آیات (بڑی سبق آموز اور عبرت آمیز نشانیاں) ہیں اور ہم کو تو
بہرکیف ان لوگوں کو گردشیں دینا ہی تھیں اور ان کی آزمائش کرنا ہی تھی۔

۳۱۔ پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کر دی (جو ان کی جانشین ہوئی)۔

(۱۱) وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰہِ
الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۷/۱۵)

اور ہم نے جناب داؤد اور جناب سلیمان علیہم السلام دونوں کو علم سے بہرہ ور کیا اور
دونوں (یک زبان ہو کر) پکار اٹھے۔

الحمد للہ (تمام تعریف و توصیف اور شکر و سپاس اللہ ہی کے لئے ہے کہ) جس
نے ہم کو اپنے بہت سے مومنین بندوں پر فضیلت بخشی۔

۱۲۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ؕ
آٰللّٰہُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ (۲۷/۵۹)

اللہ تعالیٰ نے جناب محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مختلف قوموں کے قصے
اور ان پر نازل کردہ عذاب کا حال بیان کرنے کے بعد تاکیداً فرمایا کہ (اے رسولِ کریم
علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ اس کا اعلان فرما دیں کہ

الحمد للہ (تمام تعریف و توصیف اور شکر و سپاس صرف اللہ کے لئے ہی ہے)
اور اس کے منتخب کردہ برگزیدہ بندوں پر سلام ہے۔

(چونکہ اللہ ہی یقیناً ان لوگوں کے خود ساختہ شرکاء سے بہتر ہے اس لئے صرف وہی اس کا سزاوار ہے کہ کہا جائے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ)۔

(۱۳) اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ .... وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ .... سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۷/۹۱-۹۳)

بفرمانِ ربِ کعبہ جناب رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ

۹۱۔ مجھے تو یہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکّہ) کے رب کی عبادت کروں کہ جس نے اس شہر کو محترم قرار دیا ہے اور (کائنات کی) ہر چیز اسی کی (ملکیت) ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں (مسلمین) میں سے ہو جاؤں۔

۹۲۔ اور (مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے) کہ میں قرآن کی تلاوت کیا کروں (لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنایا کروں اور اس پر خود عمل کر کے دکھایا کروں اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کو کہا کروں اور لوگوں پر یہ واضح کر دوں کہ) جو شخص ہدایت قبول کر لے گا اس ہدایت کا فائدہ خود اس کی ذات کو ہو گا اور جو شخص ضلالت اور گمراہی اختیار کرے گا (تو وہ اس کا وبال خود بھگتے گا) (اس بارے میں مجھے جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ) اے رسولؐ! آپ لوگوں سے فرمادیں کہ میں تو منذرین میں سے ایک منذر ہوں۔ (میرا کام تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو ان کے غلط اور گمراہ کن اعمال کے الم انگیز نتائج کے متعلق ان کو قبل از وقت خبردار کر دوں تاکہ وہ اگر چاہیں تو اپنی اصلاح کر لیں)۔

۹۳۔ (مجھے فرمایا یہ گیا ہے کہ) کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اور شکر گزاری کا سزاوار صرف اللہ ہے۔

وہ عنقریب تم لوگوں کو اپنی آیات (نشانیاں) دکھا دے گا اور تم لوگ ان کو اچھی طرح سے پہچان لوگے اور اللہ اس سے قطعاً غافل اور بے خبر نہیں ہے جو تم عمل میں لاتے رہتے ہو۔

(۱۴) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ....

فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ......
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ
نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً .... قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۶۱ — ۶۳/۲۹)

۶۱۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کون ہے وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور شمس و قمر کو مسخر کر کے (ایک خصوصی نظام میں جکڑ) دیا۔ تو یہ لوگ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ ذات خود اللہ ہی ہے .... تو پھر (اللہ جانے) یہ کہاں الٹے پھرے جا رہے ہیں (اللہ کے نظام کو قبول نہیں کرتے)۔

۶۲۔ حالانکہ یہ اللہ ہی ہے جو اپنے قانونِ مشیت (اور صوابدید) کے مطابق اپنے بندوں میں سے جس کے لئے مناسب سمجھتا ہے اس کے رزق میں فراخی کر دیتا ہے اور جس کے لئے مناسب گردانتا ہے اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک ہے ہی نہیں کہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے (وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کا حق دار ہے کہ اس کا رزق فراخ کر دیا جائے اور کون اس کا مستحق ہے کہ اس کے رزق میں تنگی کر دی جائے)۔

۶۳۔ (اور یہ تو کھلی حقیقت ہے کہ رزق کا دار و مدار بارش اور زمین پر ہے) تو اگر آپ ان سے یہ سوال کریں کہ کون ہے وہ ذات جو آسمان (بادلوں) سے بارش برساتی ہے اور پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتی ہے (کہ اس سے رزق اگنا شروع ہو جاتا ہے) تو یہ لوگ ضرور یہ جواب دیں گے کہ ذات یقیناً اللہ ہی ہے۔ تو اس پر آپ فرما دیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (تمام تعریفوں اور شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے ...... اور یہ لوگ بھی اللہ کی ان قدرتوں کو خوب جانتے اور مانتے ہیں)، مگر ان کی اکثریت عقل سے کام نہیں لیتی (کہ جب رزق کا ضامن اللہ ہی ہے تو پھر یہ لوگ غیر اللہ کی طرف کیوں دوڑے جاتے ہیں)۔

(۱۵) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
(۳۱/۲۵)

اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ کون ہے وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق

فرمایا ہے تو ضرور بضرور یہ لوگ یہی جواب دیں گے کہ (اللہ)، تو آپ فرما دیں کہ الحمد للہ (سب حمد و تعریف اور شکر و سپاس گذاری کا سزاوار اللہ ہے کہ جس نے ان کو اس بات کا تو قائل کر رکھا ہے کہ اس قسم کی تخلیق صرف اللہ ہی کر سکتا ہے) مگر ان لوگوں کی اکثریت اس ابدی اور اٹل حقیقت کا علم اور سمجھ نہیں رکھتی (کہ ایسا کہنے کا مطلب کیا ہے)۔

(١٦) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ○ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَ هُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ○ (۳۴/۱-۲)

۱۔ الحمد للہ (اس اللہ کی تعریف و توصیف اور شکر و نیاز برحق ہے کہ تمام آسمانوں اور زمین کی ہر چیز جس کی ملکیت ہے اور آخرت میں صرف اسی کی حمد ہوگی اور زمین کی تمام چیزوں کی تخلیق اور ان پر اقتدار اللہ کی حکمت کی بنا پر ہے اور ان سب کی اس کو مکمل طور پر خبر اور علم بھی ہے۔

۲۔ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا رہتا ہے وہ اس کو بھی خوب طرح سے جانتا ہے اور جو کچھ زمین سے خارج ہو کر باہر آتا رہتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے (نیچے اترتا ہے) اس کو بھی وہ اچھی طرح سے جانتا ہے اور جو کچھ آسمان میں عروج کر جاتا ہے (آسمان میں چڑھ جاتا ہے اوپر چلا جاتا ہے) وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔ وہ رحیم اور غفور ہے (اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ زمین کی پیداوار کا محکم نظام رُو بہ عمل رہے تاکہ لوگوں کو رزق ملتا رہے اور اس کی مغفرت کا تقاضا ہے کہ آسمان سے رحمت کا نزول ہوتا رہے جیسے بارش وغیرہ اور بعض مضر قسم کے مادے اور بخارات وغیرہ فضا کی بلندیوں میں جا کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں کہ ارضی مخلوق محفوظ رہے۔

وقس علیٰ هذا، آسمان اور زمین کے بے شمار فرائض ہیں جو یہ دونوں بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے انجام دیتے رہتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... اِنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ
مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَ مَا یُمْسِكْ ۙ فَلَا
مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

(۳۵/۱ ـ ۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (سب تعریفوں اور شکر کا سزاوار وہ اللہ ہے) کہ جو آسمانوں اور زمین کا فاطر ہے۔ ان سب کو بلا کسی نقشہ یا مادہ مواد کے محض اپنی قوّتِ تخلیق کے زور پر تخلیق فرمادیا۔

اور اس نے ملائکہ کو جو دو دو، تین تین اور چار چار لہروں والی کائناتی قوتیں ہیں رسول بنادیا (کہ وہ اس کا پیغام کائنات کے گوشے گوشے میں لے جاتے ہیں اور انبیاء کی طرف وحی بھی اسی قسم کے ملائکہ لایا کرتے تھے جیسے جناب جبریل امین علیہ السلام) اور اللہ تو اپنی مخلوق میں اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایزاد و اضافہ بھی فرماتا رہتا ہے۔ یقیناً اللہ نے ہر ہر چیز کے لئے قاعدے اور قوانین اور معیار و اقدار مقرر فرمائے ہوئے ہیں۔

اللہ اپنے بندوں کے لئے اگر رحمت کا کوئی دروازہ کھول دے تو کوئی اس کو بند نہیں کرسکتا اور اگر وہ کوئی دروازہ بند کردے تو کوئی اس کے بعد اس کو کھولنے اور جاری کرنے والا نہیں ہوسکتا اور اللہ تو عزیز اور حکیم ہے۔ اس کی عزّت اور غلبہ سب کو محیط ہے مگر اس کا یہ غلبہ اور قوّت حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ
ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ○ وَ قَالُوا
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا
لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ ○ الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ
فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ○

(۳۵/۳۳ ـ ۳۵)

نیکیوں میں سبقت لے جانے والے لوگوں پر اللہ کے فضلِ کبیر کا ذکر ہو رہا ہے کہ

۳۳۔ حیاتِ جاودانی ہوں گے ابدی باغات جن میں وہ داخل ہوں گے۔ وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے (بطور شرف اور اعزاز کے) اور ان کا لباس ان باغوں میں ریشمی (حریری) ہوگا۔

۳۴۔ اور وہ پکار اٹھیں گے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

شکر و تمجید اور توصیف و تحمید اس اللہ کی جس نے ہم سے غم اور حزن کو دُور فرما دیا۔ بے شک ہمارا رب غفور بھی ہے اور شکور بھی۔ اس نے کمالِ مہربانی سے ہماری مغفرت فرمادی اور ہماری حمد و توصیف اور شکر سپاس گزاری کی قدر کی۔

۳۵۔ یہ اللہ تو وہ ذاتِ کریم ہے کہ جس نے اپنے فضل سے ہم کو ہمیشہ کے رہنے کے لئے دائمی قیام گاہ جیسے گھر میں اتارا۔ اس میں نہ ہم کو کوئی رنج پہنچے گا اور نہ ہی ہم کو کوئی تکان و پریشانی مس کرے گی۔

(۱۹) سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (۳۷/۱۸۰—۱۸۲)

یہ سورہ الصافات کی آخری آیات ہیں اور بڑی ہی اہم اور جلیل القدر آیات ہیں۔ دراصل اللہ جل شانہٗ اپنے رسولِ کریمؐ کو کچھ اہم ہدایات دے رہا ہے اور فرمایا یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے ایک خاص مدت تک مُنہ موڑ لیں۔ لاتعلق ہو جائیں اور ان کو نگاہ میں رکھیں۔ یہ عنقریب اپنا (ہولناک) انجام دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد فرمایا۔

۱۸۰۔ یہ کافر اللہ سے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں تیرا رب اس سے بہت بلند، منزہ، پاک اور سبحان ہے۔ وہ تو رب العزت ہے۔ اس کی عزت اور غلبہ کی تو کوئی مثال اور جواب نہیں ہے۔

۱۸۱۔ (اور یہ لوگ اللہ کے بھیجے ہوئے مرسلین (رسولوں) کی بھی تکذیب و تحقیر کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کی طرف سے ان تمام مرسلین پر سلام ہی سلام ہے۔

۱۸۲۔ اور سو بات کی ایک بات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

سب تعریف و توصیف حمد و مجد اور شکر و سپاس گزاری اللہ ہی کے لئے وقف ہے

جو ربّ العالمین ہے۔

(۲۰) ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ
رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹/۲۹)

اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے (اس کا تقابل ۱۶/۷۵ سے کریں)

ایک شخص ہے کہ اس میں کئی شریک ہیں جو بد اخلاق، ضدی اور مختلف المزاج ہیں (اور یہ سارے اس کے آقا اور مالک ہیں) ایک اور آدمی ہے کہ وہ مکمل طور پر صرف ایک آدمی کی ملکیت ہے (اس کا غلام ہے)۔ کیا یہ دونوں آدمی برابر ہو سکتے ہیں۔ (قطعاً نہیں۔ جو بہت سارے آقاؤں کا غلام ہو گا اس کی جان تو عذاب میں آئی رہے گی اور جو محض ایک آقا کا غلام ہو گا اس کو کوئی پریشانی نہ ہو گی اور اس قسم کا آدمی جو تنہا ایک ہی ہستی کا غلام ہو گا وہ اپنی خوش بختی پر فرحاں و نازاں ہو گا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلے گا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ صرف ایک آقائے واحد کا غلام ہوں۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے (کہ شرک کتنی ذلت، بے چینی، حرماں نصیبی اور کم بختی کا موجب بنتا ہے اور اس کے مقابلے میں توحید انسان کے اندر کس قدر اطمینان، خوشی اور راحت پیدا کر دیتی ہے)۔

(۲۱) وَ سِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ......
فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ ۝ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا
وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ
نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝ وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ
مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَ قُضِیَ بَیْنَهُمْ
بِالْحَقِّ وَ قِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۷۵–۳۹/۷۳)

بڑی ہی جلال و جمال کی حامل آیات ہیں ان کا کماحقہٗ مفہوم بیان کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ تاہم نقشہ کچھ یوں ہے کہ

آیات ۷۱ اور ۷۲ میں کافروں کا تذکرہ ہے کہ کس طرح وہ گروہ در گروہ داخلِ جہنم کئے جائیں گے اور وہاں ان پر حسرت و یاس کا جو عالم ہو گا اور جس دائمی کرب و عذاب میں

وہ مبتلا ہوں گے اس کا بیان رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اور بدن میں کپکپی ہونے لگتی ہے۔

اس کے بعد آیت نمبر ۲۷ سے تقابل کے طور پر متقی لوگوں کا ذکرِ جمیل اور انجامِ خوش کا بیان ہے۔ ارشاد ہے۔

۷۲۔ اور جو لوگ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کئے ہوئے تھے (متقی تھے۔ اللہ کے اوامر و نواہی کے دل و جان سے پابند تھے) وہ بھی گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور جنت کے نگران ان سے کہیں گے کہ سلام علیکم طبتم (تم پر سلام ہو تم لوگ تو بہت ہی اچھے رہے)۔ پس ہمیشہ کے لئے اس جنت میں داخل ہو جایئے۔

۷۳۔ اور وہ اس وقت لہرا لہرا کر، جھوم جھوم کر مستانہ وار فرطِ مسرت سے کہیں گے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

(اللہ کی ہزار ہزار تعریف اور توصیف ہو اور اس کا لاکھ لاکھ شکر ہو) کہ جس نے ہمارے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو سرزمینِ جنت کا وارث بنا دیا۔ اب ہم جہاں چاہیں اس جنت میں رہیں۔ نیک اعمال کرنے والوں کا اجر بھی کیا خوب ہوگا۔

۷۴۔ اور تم دیکھو گے کہ ملائکہ (اللہ کے) عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے ربّ کی حمد میں سرشار اور محوِ تسبیح ہوں گے اور جنت میں داخل ان لوگوں کے مابین نہایت حق و انصاف سے فیصلہ ہو چکا ہوگا اور کہا جائے گا (ہر طرف سے یہی نعرہ بلند ہوگا) کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ ربّ العالمین سب حمد و تعریف کا حق دار صرف اللہ ہے جو ربّ العالمین ہے۔

(۲

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً
وَّ صَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَ رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ
ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
ہُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ؕ
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
(۶۴—۶۵/۴۰)

ات ہیں۔ ان کا زورِ بیان اور شکوہ و شان محسوس تو کی جا سکتی ہے بیان نہیں
سکہ

ہے کہ جس نے تم سب کے لئے اس زمین کو جائے قرار بنایا

دکہ تم اس میں قیام و قرار کرو۔ وہ زمین کہ جو روزانہ اور سالانہ زبردست گردشوں میں محوِ پرواز ہے۔ اپنے باسیوں کے لئے کس قدر جائے سکون بنا دی گئی ہے کہ ان کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک بڑی زبردست متحرک چیز پر قیام پذیر نہیں (سوار ہیں)۔
اور آسمان کو ایک چھت بنا کر تان دیا گیا ہے جو ہزارہا آفتوں سے انسانوں کی حفاظت کرتا ہے۔

پھر اللہ نے تم لوگوں کی جو صورتیں بنائیں تو کتنی حسین صورتیں بنائیں۔ (ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی مگر دونوں حسین۔ اولاد کی صورتیں ماں باپ سے مشابہ مگر ہر ایک کا الگ الگ حسن اور نقشہ، ہر ایک ملک کے باسیوں کے الگ رنگ و روپ، الگ نقش و نگار مگر سارے حسین۔ وقس علیٰ ھذا۔)
اور پھر تم کو جو رزق دیا وہ کس قدر طیب (پاکیزہ، خوشگوار، خوش ذائقہ، خوش رنگ، خوشبو، صحت افزا اور ذائقہ دار)۔ یہ سب کچھ کرنے والا ہی تو تم سب کا اللہ اور تم سب کا رب ہے۔ آہا ہا یہ رب العالمین کتنا برکت والا ہے (کہ زمین کے باسیوں پر برکتوں کا مسلسل نزول کئے جا رہا ہے)۔

۶۴۔ یہی اللہ تو الحیّ ہے جو خود ابد تا ازل زندہ رہے گا اور تمامی ذی حیات کو زندگی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی الٰہ (اس قسم کا با اقتدار مطلق صاحبِ اختیار) ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا تم لوگ دین کو اسی کے لئے خالص کر کے صرف اور صرف اسی کو پکارو اور اسی سے یہی دعائیں مانگو اور بار بار نعرہ لگاؤ کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

سب حمد و تعریف اور شکر و نیاز مندی صرف اللہ کے لئے جو ربّ العالمین ہے۔

ہم نے قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا چند مقامات کو سرسری طور پر دیکھا جہاں جہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا ذکر ہوا ہے۔ اگر سیاق و سباق سمیت ان مقامات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو قاری کے دل و دماغ میں یہ سما جاتا ہے اور رچ بس جاتا ہے کہ حمد کا سزاوار صرف اور صرف اللہ واحد ہے جو ربّ العالمین ہے۔

○

الحمد للہ ربّ العالمین۔ وَالصّلوٰۃ والسّلام علیٰ رسولہ النّبی الکریم رحمۃ العالمین۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ

آویزشِ حق و باطل

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ازل سے تا امروز قرآنِ کریم میں ہے کہ ابلیس کی نمود، تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی ہوئی ہے اور اسے قیامت تک کے لئے مہلت بھی دے دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر و شر کا تصادم اور حق و باطل کا تزاحم ناگزیر ہوگا۔ جہاں حق کی آواز اٹھے گی، باطل کی فریب کاریاں اور رستخیزیاں اسے دبانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں گی۔ جہاں کہیں "چراغِ مصطفویؐ" نور افشاں ہوگا "شرارِ بولہبی" اس سے ستیزہ کار نظر آئے گا۔ تغیراتِ زمانہ سے اس تزاحم و تصادم کے انداز بدل جائیں گے لیکن اصل مخالفت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے گی۔ جنگ کے محاذ بدل جائیں گے۔ آلاتِ حرب و ضرب کی شکلوں اور نوعیتوں میں تبدیلی ہو جائے گی۔ لیکن حریفانِ پنجہ شکن وہی رہیں گے، نہ "فطرتِ اسد اللّٰہی" بدلے گی نہ قلبِ "مرحبؔ و عنتری" میں کوئی تغیر واقع ہوگا۔ وہی ابنِ آدم اور وہی جنودِ ابلیس۔ حضرت نوحؑ سے جنابِ عیسٰیؑ تک کے سلسلۂ رشد و ہدایت پر ایک نگاہ ڈالئے۔ یہ سلسلہ دراز کیا ہے؟ ایک داستانِ مسلسل ہے اسی تزاحم و تخالف کی۔ جہاں حق و صداقت کی آواز بلند ہوئی، ابلیسی جیوش و عساکر اپنی پوری قوتوں کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لئے سامنے آ گئے۔ ان ابلیسی جیوش و عساکر کی تفاصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہوں، اصولی طور پر یہ دو بنیادی شقوں میں تقسیم ہوں گے اور مزید تجزیہ کے بعد نظر آئے گا کہ یہ بنیادی شقیں بھی درحقیقت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ اس اصل کا نام، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "مترفین کا گروہ" ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر بڑی عیش پرستی کی زندگی بسر کریں۔ غریب، مزدور، محنت خون پسینہ ایک کر کے کمائیں اور یہ مختلف طریقوں اور کی متنوع حربوں سے، ان کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر مزے اڑائیں۔ مفاد پرستوں کے اس گروہ کی ایک شاخ کا نام، ملوکیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری (اور دورِ حاضر کے جدید نظام کی رُو سے) صنعت کاری اور

ارخانہ داری ہے اور دوسری شاخ، مذہبی پیشوائیت پر مشتمل ہے۔ مقصد دونوں گروہوں کا ایک ہے ـــ
ہی غریب کمائیں اور یہ کھائیں۔ ان دونوں گروہوں کی آپس میں ملی بھگت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایک کے
فیر دوسرا گروہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ برہمن، راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دے کر، عوام کو اس کی پرستش پر آمادہ کرتا
ہے اور راجہ، برہمن کی رکھشا (حفاظت کا ذمہ لے کر اسے عوام کے قلب و دماغ پر سوار رہنے کے قابل بناتا ہے۔
مدا کے رسول آتے ہی اس لئے تھے کہ مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان مفاد پرستوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا
نہیں صحیح آزادی عطا کریں۔ ان کے خلاف، ان دونوں گروہوں کا اٹھ کھڑے ہونا لازمی تھا۔ یہی ہے وہ کشمکش
د پہلے دن سے آج تک چلی آرہی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں اور جہاں خدا کا کوئی
سول آیا ارباب مذہب عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے ایک طرف صف آراء ہو گئے اور ارکانِ دولت ـــ و
فتدار استبداد و قہرمانی کے تمام حربات و آلات کو ساتھ لے کر دوسری طرف نبرد آزما۔ مدعیانِ حق کی تکذیب و
ذلیل کی گئی۔ ان کی حق پرستی کا مضحکہ اڑایا گیا۔ ان کی دعوتِ انقلاب کا استقبال استخفاف و استہزا سے
لیا گیا۔ ان کی انسانیت پرور تحریک کو کچلنے کے لئے ہر قسم کی تخویف و ترہیب سے کام لیا گیا۔ کہیں ان سے کہا
لیا کہ اگر اپنی اس دعوتِ انقلاب سے باز نہیں آؤ گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۱۶)

لوگوں نے کہا " اے نوح! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اس دعوتِ انقلاب کو برابر جاری
رکھے گا تو یاد رکھ) تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

سی کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اپنی روش نہ بدلو گے تو جلا وطن کر دیئے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ۝ (۲۶/۱۶۷)

لوگوں نے کہا " اے لوط! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اپنی اس دعوت کو بند نہیں کریگا)
تو (یاد رکھ) تمہیں شہر بدر کر دیا جائے گا۔

ہیں قسمیں اٹھا اٹھا کر فیصلے کئے گئے کہ اس جماعت کے تمام افراد کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے
ہ یہ ہر روز کی خلفشار ختم ہو۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ
مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۷/۴۹)

اُن (نو آدمیوں) نے کہا " ایک دوسرے کے سامنے خدا کے نام پر حلف اٹھاؤ کہ ہم اچانک
صالح اور اس کے ساتھیوں کو رات کے وقت فنا کے گھاٹ اتار دیں گے اور پھر اس کے

ورثاء سے کہہ دیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو [illegible] تھا جنہوں نے ان کے خاندان کو تباہ و ہلاک کر دیا ہے اور یقیناً ہم (اپنے بیان میں) سچے ہیں۔

کہیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس انداز کو نہیں بدلو گے تو زندہ آگ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ ..... (۲۹/۲۴)

تو ابراہیم کی قوم کا (اس کے سوا) کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے (یہ یوں باز نہیں آئے گا) اسے قتل کر ڈالو یا (آگ میں) جلا دو۔

کہیں سرکشی و تمرد کی تمام قوتیں جمع ہو گئیں کہ اس انقلابی تحریک کے بانی کا خاتمہ کر دیا جائے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ سامانِ ربوبیت صرف خدا کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔ انسانوں کے اقتدار میں نہیں۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ .... (۴۰/۲۸)۔

خاندانِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے کہا 'جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا'' کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے (اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی جرم نہیں)''۔

قصۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش کردہ صداقت کو بے نقاب دیکھ لیا تو انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا اور ربِّ موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ اس پر فرعون کی قہرمانیت پورے جوش میں آگئی اور اس نے گرج کر کہا کہ

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝ (۲۰/۷۱)

فرعون نے کہا" تم بغیر میری اجازت کے موسیٰ پر ایمان لے آئے ؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں باطل سکھایا ہے۔ اچھا، دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا (یا ہتھکڑیاں بیڑیاں پہناؤں گا) اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے !

اور پھر اسی داستانِ بنی اسرائیل کے مقطع کے بند کو دیکھئے، جب خدا کی آخری حجت نفسِ مسیحائی کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تاکہ اگر ان کے عروقِ مردہ میں کچھ بھی صلاحیت باقی ہو تو ان میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیا جائے تو اس مقدس کوشش کے جواب میں یہودیوں کے احبار و رہبان اور بازنطینی شاہنشاہیت کے عمائد و ارکان خرقہ و سجادہ کی دسیسہ کاریوں اور شمشیر و سناں کی آتش باریوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے کہ اس داعیٔ انقلاب کو حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔

غرضیکہ اگر آپ تاریخ کی رصدگاہوں سے نوعِ انسان کی داستانِ حیات کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ پوری داستان ایک حکایتِ مسلسل ہے کشمکشِ خیر و شر اور ستیزہ کاریٔ حق و باطل کی۔ جب اور جہاں حق کی آواز بلند ہوئی، طاغوتی قوتیں، ہجومِ مخالفت کے ساتھ چاروں طرف سے اُمنڈ کر حلقہ گیر ہو گئیں۔ چنانچہ جب صدق و عدل کی یہی انقلاب آفریں آواز فاران کی وادیوں سے بلند ہوئی تو ابلیسی جنود و عساکر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ یورش کر کے مقابلہ کے لئے صف آرا ہو گئے

وادیٔ فاران میں

اس مقابلہ کی سختی اور مخالفت کی شدت کا اندازہ کرنے کے لئے عربوں کی ان نفسیاتی خصوصیات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ان کے لئے قبولیتِ حق کی راہ میں حائل تھی ان کا قومی تفاخر اور قبائلی عصبیت تھی۔ ابوجہل نے برملا کہہ دیا کہ ہم نے ہر میدان میں بنو ہاشم کی برابری کی ہے اور انہیں کبھی آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن اب یہ نبوت کو اپنے گھرانے میں لے آئے ہیں تو ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے اس دعوے کو سچا مان کر ان کی عظمت کو تسلیم کر لیں اور یوں ان کے خاندان کو اپنے خاندان سے زیادہ معزز و مکرم بنا دیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت، دلائل و براہین کی بنا پر نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ انہوں نے اس دعوتِ انقلاب کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا اور اسے حق کے خلاف پایا اس لئے اس سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار صرف تکبر کی بنا پر تھا۔

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ۝ (۳۸/۲)

(کسی معقول بنا پر نہیں) بلکہ جو لوگ انکار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ جھوٹی عزت اور عداوت پر ایسا کئے ہوئے ہیں۔

وجوہاتِ مخالفت

وہ کہتے تھے کہ اس شرف و مجد کے لئے یہی انسان کیوں منتخب ہوا ہے؟

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ

(۲/۱۰۵)

اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے' وہ' اور مشرکین مکہ' دونوں
نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحی الٰہی) نازل ہو۔
ان کا اعتراض یہ تھا کہ خدا اس سے باتیں کرتا ہے' ہم سے کیوں نہیں کرتا؟

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ (۲/۱۱۸)

اور جو لوگ (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکینِ عرب) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہِ راست بات چیت کرے یا اپنی کوئی (عجیب و غریب) نشانی بھیجدے۔

وہ نہایت تکبّر اور غرور اور نفرت و حقارت سے کہتے کہ اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں' ہم پر کیوں نہیں ہوتے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۵/۲۱﴾

اور جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا کرنے کی توقع نہیں کرتے (یعنی آخرت کی زندگی کے منکر ہیں) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے' تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ براہ راست خود ہم پر فرشتے اتار دیئے جائیں (جو خدا کی تعلیم ہم تک پہنچا دیں) یا ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں (اور جو کچھ اسے ہم سے کہنا ہے وہ بلاواسطہ ہم سے کہہ دے) حقیقت یہ ہے کہ یہ محض تکبّر کی وجہ سے ہے جو یہ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور سخت قسم کی سرکشی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اس آیت جلیلہ کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہ یہ تمام اعتراضات محض تکبّر کی بنا پر کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کے فرد تھے' اس لئے ان کے اس تکبّر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شرفِ نبوت ذلیل خاندان کے حصہ میں کیوں آیا ہے بلکہ یہ کہ قریش کے مختلف گھرانے اپنے میں سے کسی کو بڑا نہیں سمجھتے تھے اس لئے اس امر کا تصور بھی انہیں سخت گراں گزرتا تھا کہ انہی میں سے ایک خاندان اس طرح باقیوں پر سبقت لے جائے۔ یہ تھا وہ جذبۂ نخوت جو قبولِ حق کی راہ میں اس درجہ عناں گیر ہو رہا تھا۔

ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ (۳۸/۸)

(وہ لوگ جو ازراہِ عناد کہتے ہیں) کیا ہمارے درمیان میں سے (سب کو چھوڑ کر) صرف اسی پر ذکر و موعظت (قرآن) نازل کیا گیا ہے؟

قبائلی تفاخر کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مال و دولت بھی وجۂ عزت و باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ پہلے سامنے آچکا ہے، حضورؐ کا شمار ان کے رؤسا میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اس چیز پر بھی اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (۴۳/۳۱)

اور وہ لوگ (ازراہِ اعتراض یہ بھی) کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف کے سرداروں) میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کر دیا جاتا (جو دولت و ثروت کے لحاظ سے معزز ہوتا)۔

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، جس انقلاب کی دعوت رسولوں کی طرف سے دی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریبوں، ناداروں، کمزوروں اور مظلوموں کو، طاقت وروں اور دولت مندوں کے پنجۂ خونیں سے چھڑایا جائے۔ لہٰذا، ظاہر ہے کہ اس دعوت پر سب سے پہلے، غریبوں کا طبقہ لبیک کہے گا۔ آپ قرآن میں بیان کردہ، اوّلیں دعوت کو دیکھئے۔ حضرت نوحؑ کی جماعت کے متعلق سردارانِ قوم کا یہ حقارت آمیز طعن ہمارے سامنے آتا ہے کہ

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ (۱۱/۲۷)

اس پر قوم کے ان دولت مند سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نفرت و حقارت

یہی کیفیت قرآنی تحریک انقلاب کی تھی۔ جو سعید روحیں سب سے پہلے جماعت مومنین میں شامل ہوئیں ان میں اکثریت غربا ہی کی تھی، اس لئے اکابر قریش انہیں بنگاہِ حقارت دیکھتے اور طنزاً کہتے کہ

أَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا (۶/۵۳)

کیا یہی ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ نے ہم میں سے اپنے بذل و احسان کے لئے چن لیا ہے؟

نہ صرف ذلیل ہی بلکہ انہیں سفیہ (بیوقوف) بھی کہتے۔

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ (۲/۱۳)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ (اپنی مفسدانہ روش سے باز آجاؤ اور راست بازی کے ساتھ) ایمان کی راہ اختیار کرو جس طرح اور لوگوں نے اختیار کی ہے، تو کہتے ہیں کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح (یہ) بے وقوف آدمی ایمان لے آئے ہیں۔

بشریت پر اعتراض

نبی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ، خدا سے ہم کلام ہونے کے باوجود، عام انسانوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی امتیازی خصوصیت (وحی کے بعد) اس کی سیرت کی بلندی ہوتی تھی۔ لیکن مذہبی پیشوائیت، عوام کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتی تھی کہ نبی عام انسانوں سے الگ تھلگ، ایک عجیب قسم کی محیر العقول ہستی ہوتی ہے۔ اس سے قدم قدم پر معجزے سرزد ہوتے ہیں۔ اس کی ہر بات خارقِ عادت اور خلافِ فطرت ہوتی ہے۔ فرشتے اس کے جلو میں چلتے ہیں۔ اس سے پتھر باتیں کرتے ہیں۔ پہاڑ اس کے اشارے پر کانپنے لگ جاتے ہیں۔ وہ خشک زمین سے تر و تازہ پھل اگا دیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ سے سینکڑوں بیماری دور ہو جاتی ہیں۔ اس کی ایک آواز پر مُردے جی اُٹھتے ہیں۔ اربابِ مذہب، خدا کے رسولوں کے متعلق اس قسم کا تصور، عوام کے ذہن میں پیوست کر دیتے ہیں اور جب رسول، ان کے اس تصور پر پورا نہیں اترتا تھا وہ اسے جھٹلاتے تھے۔ تنگ کرتے تھے۔ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ

رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ٥ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی ہے؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دے اور ایمان والوں کو خوشخبری دیدے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے۔ اسی لئے کفار کہتے ہیں کہ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ز وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ٥ (۳۸/۴)

اور لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ان کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا؟ اور (اس بنا پر) منکرین دعوت کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔

سورۃ قٓ میں ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ٥ (۵۰/۲)

(یہ لوگ کسی دلیل و برہان سے انکار نہیں کر رہے) بلکہ انہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (یعنی رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا۔ چنانچہ منکرینِ دعوت کہتے ہیں کہ یہ تو عجیب سی بات ہے (جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی)۔

اس کہنہ اعتراض کی صدائے بازگشت کہ رسول مافوق البشر ہونا چاہیئے۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ٥ (۱۷/۹۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو اس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہو کر) کہنے لگے "کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) آدمی پیغمبر بنا کر بھیجدیا ہے؟"

مخالفین کے سرغنے خفیہ سازشوں میں اسی اعتراض کو پیش کر کے عوام کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش

کرتے تھے۔

وَ اَسَرُّوا النَّجْوَی ۖ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ (۲۱/۳)

یہ مخالفین جو اس طرح سرکشی پر اُترے ہوئے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہیں اور عوام سے کہتے ہیں کہ "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ جاتے ہو جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؛ رسول کو تو "خدا کا اوتار" اور "الوہیت کا مظہر" ہونا چاہیئے۔

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ (۲۵/۷)

یہ لوگ کہتے ہیں "اس رسول کو کیا ہو گیا کہ وہ (عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ (اس میں اور عام انسانوں میں فرق ہی کیا ہے؟) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ اُترتا جو اس کے ساتھ ساتھ (لوگوں کو انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتا۔

وُہی اسلاف پرستی

یہ تو تھا رسول کے متعلق۔ باقی رہا اس کا پیغام۔ سو اس کی مخالفت میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ ہزار دلیلوں کی ایک دلیل اور لاکھ براہین کی ایک برہان یہ تھی کہ یہ تعلیم ہمارے آباء واجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ وہی "دلیل" جس نے نوعِ انسانی کو علم و بصیرت کی راہوں پر گامزن ہونے سے ہمیشہ روکا۔ وہی "برہان" جس کی وجہ سے انسان کی تفکر و تدبر کی قوتوں پر ہمیشہ جمود و تعطل کا فالج گرتا رہا۔ وہی تقلیدِ اعمیٰ (بریفالٹ کے الفاظ میں ـــــ (CUSTOM THOUGHT) جس نے انسانیت کو ارتقائی مدارج طے کرنے سے ہمیشہ باز رکھا۔ وہ جذام کے مہلک جراثیم، دین و دانش کے جسدِ صالح کی ہلاکت میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے۔ وہ نگہ فریب شخصیت پرستی جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حجابِ اکبر بن کر حائل رہی۔ یعنی ابلیس کا وہ حربہ جس سے اس نے ابنِ آدم کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم سے ہمیشہ گمراہ کیا۔ قرآن، علم و بصیرت اور عقل و دانش کی دعوت تھی لیکن مذہبی پیشوائیت کے نزدیک آنکھیں بند کر کے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے جانا ہی سلامتی

حق وصداقت تھا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۷۰)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو (اور خدا کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لو) تو کہتے ہیں، نہیں، ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ (افسوس ان کی بے انشی وجہالت پر!) کوئی ان سے پوچھے، اگر تمہارے اسلاف عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں، تو تم بھی عقل وہدایت سے انکار کردو گے؟

سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۵/۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (عقل وبصیرت کی) اس بات کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے۔ نیز اللہ کے رسول کی طرف رجوع ہو تو کہتے ہیں، ہمارے لئے تو وہی طریقہ بس کرتا ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے۔ (ان سے پوچھو کہ) اگر ان کے باپ دادا کچھ جانتے بوجھتے نہ ہوں اور راہِ راست پر بھی نہ ہوں (تو کیا وہ پھر بھی انہی کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے؟)

وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے (اور مسلکِ تقلید میں اس کی ضرورت سمجھی ہی نہیں جاتی) کہ جس ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اس کے متعلق کبھی اتنا تو سوچ لیا جائے کہ یہ فلاح وسعادت کی جنت کی طرف لئے جا رہی ہے یا ہلاکت وبربادی کے جہنم کی طرف۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ (۳۱/۲۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت) کی پیروی کرو جو اللہ نے (اپنے رسول پر)

نازل کی ہے تو کہتے ہیں (نہیں [illegible] اس راہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو چلتے پا [illegible] (ان سے پوچھو کہ) اگر (اس طرح) شیطان انہیں جہنم کے عذاب کی طرف بلاتا رہے. (حتیٰ کہ وہ جہنم کے یقینی مستحق ہو جائیں تو کیا پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے رہیں گے ؟)

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا سارا مدار، اسلاف کی پرستش پر ہے. وہ پہلے اسلاف کی عظمت لوگوں کے دل میں راسخ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنے آپ کو، ان اسلاف کی عظمت کے محافظ اور ان کے مسلک کے نگہبان کی حیثیت سے پیش کر کے، لوگوں سے اپنی پرستش کراتے ہیں. جس مسلک کی دعوت، رسولوں کی طرف سے دی جاتی تھی، اس میں، ان مذہبی پیشواؤں کی مفاد پرستیوں پر براہِ راست زد پڑتی تھی. وہ یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ ہم اس کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ہماری روٹی چھنتی ہے. نہ ہی وہ علم و بصیرت کی بناء پر اس کی تردید کر سکتے تھے. وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے. ان کے ہاتھ میں یہ بڑا موثر حربہ تھا. حتیٰ کہ اگر ان کی کسی بدیہی غلط روی کی طرف ان کی توجہ دلائی جاتی اور ان سے کہا جاتا کہ اس قسم کی بات، تعلیمِ خداوندی کی نہیں ہو سکتی، تو وہ یہ جواب دیتے کہ یہ بات ہمارے اسلاف سے اسی طرح چلی آ رہی ہے اور چونکہ ہمارے اسلاف، تعلیمِ خداوندی کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے اس لئے خدا کا حکم اسی قسم کا ہوگا. سورۂ اعراف میں ہے.

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۲۸)

اور یہ لوگ جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں، تو کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور (چونکہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں اس لئے) خدا نے ایسا ہی کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے (اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ خدا کبھی بھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا. کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ؟

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جن لوگوں کی حالت یہاں تک پہنچ چکی انہیں عقل و فکر کی بناء پر تعلیمِ خداوندی کی دعوت دینا کس قدر مشکل کام تھا!

—— ✲ ——

حقائق و عبر

اصولِ دین

ماہنامہ اشراق بابت مارچ ۱۹۹۴ء کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) دین اسلام کا پہلا ماخذ قرآن ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بحث اور نزاع نہیں ہے کہ یہ کہاں سے مل سکتا ہے اور اس کے مندرجات کیا ہیں۔ یہ کتاب 'الحمد' سے لیکر 'والناس' کی آیات پر مشتمل ہے' اور اس کی آیات' الفاظ' حروف اور حرکات کی تعداد تک معلوم ہے۔ پھر یہ عظیم الشان کتاب' نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی ہوئی اس طرح ہمارے ہاتھوں میں پہنچی ہے کہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت بن گئی ہے۔

سنت کے بارے میں' البتہ بہت کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کو دور کرنا بیحد ضروری ہے۔ چنانچہ' سب سے پہلے' اس سلسلہ میں یہ جان لینا چاہیئے کہ عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست احکام سُن آپ کی اطاعت کرتے تھے۔ تاہم بعد کے لوگوں کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ یہ طے کیا جائے کہ کوئی خاص حکم خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے یا ان کی طرف غلط منسوب ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں تحقیق اور احتیاط کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہمیں قرآن کے علاوہ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین دو صورتوں میں ملا ہے:

۱۔ سنتِ ثابتہ

۲۔ احادیث

سنتِ ثابتہ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عملِ متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع

یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے 'بحیثیتِ دین' اس امت کو منتقل ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح وہ قولی تواتر سے ثابت ہوا ہے، اسی طرح یہ عملی تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں، اب کسی بحث اور نزاع کی گنجائش نہیں ہے۔

احادیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی وہ روایات ہیں جو زیادہ تر اخبارِ احاد کے طریقے سے ہمیں ملی ہیں۔ ان کے متعلق صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ان کو صرف اس صورت میں تسلیم کیا جائے گا، جب وہ قرآنِ مجید، سنتِ ثابتہ اور عقل وفطرت کی اساس پر قائم ہوں اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہوں، اور قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچیں۔ اس صورت میں ان احادیث کی حجیت بھی مسلّم ہے اور ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(مولانا مودودی)

طلوعِ اسلام:۔ ماہنامہ اشراق نے اسی بات کو دہرایا ہے جو ہمارے علماء قانون سازی کے ضمن میں قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کہتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ

(۲) مسلمان کی تعریف

"ہمارے نزدیک مسلمان کی تعریف بھی یہی ہے کہ "مسلمان وہ ہے جو صرف قرآن اور سنت ہی کو دین کا ماخذ مانتا ہو" اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ تعریف کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قانونی زبان میں سادہ ترجمہ ہے۔ واضح رہے کہ صرف قرآن اور سنت "ہی" کو دین کا ماخذ مانتا ہو، "بھی" نہیں۔ یعنی قرآن کو دین کا ماخذ مانتا ہو، سنت کو ماخذ مانتا ہو اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو۔ چنانچہ، اگر کوئی شخص سنت کو تو دین کا ماخذ مانتا ہو، لیکن قرآن کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو تو دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اگر قرآن کو مانتا ہو، لیکن سنت کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو، تو بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔"

سنت کسے کہتے ہیں؟

۱۔ سنت کسے کہتے ہیں اس کے متعلق یہ حضرات آپس میں متفق نہیں۔

۲۔ ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس میں سنّتِ رسول اللہ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن تمام فرقوں کے نزدیک، قرآنِ کریم کے متن کی طرح، متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ حتّٰی کہ حدیث کا بھی ایسا مجموعہ موجود نہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

۳۔ نہ ایسی کتاب موجود ہے نہ یہ حضرات ایسی کتاب مرتب کر کے دیتے ہیں۔

۴۔ علمائے اہلِ حدیث کا مسلک اور عقیدہ یہ ہے کہ دین کی جزئیات بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحیٔ رسولِ اکرمؐ کو عطا ہوئی تھیں۔ یہ جزئیات حدیث کے مجموعہ بخاری و مسلم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے کسی حدیث کا انکار بھی کفر ہے اور کسی نئی بات کا اختیار کرنا بدعت۔ اسی کا نام سنّتِ رسول اللہ ہے۔

۵۔ مودودی صاحب کے نزدیک، ہر حدیث سنّت نہ تھی۔ سنّت ان کے نزدیک وہ ہے جس پر رسول اللہ نے بحیثیت رسول عمل فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے کہ احادیث کی کتابوں میں جو کچھ آیا ہے اس میں کون سی حدیث صحیح اور کون سی غلط ہے اور صحیح حدیثوں میں سے کونسی بات نبیٔ اکرمؐ نے بحیثیت رسول کی تھی اور کونسی اپنی شخصی حیثیت سے۔ جو باتیں حضورؐ نے بحیثیت رسول کی تھیں انہیں بھی بجز عبادات کے، ہو بہو قائم رکھنا مقصود نہیں ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے اور نئے حوادث کے سلسلہ میں جدید جزئیات بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔

۔ مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک، قرآن و حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائی تھیں ان میں سے سنّت وہ ہیں جنہیں حضورؐ نے استمراراً کیا ہو۔ ہنگامی حالات میں وقتی قضیوں کے فیصلے کے طور پر ارشاد نہ فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ (کہ حضورؐ نے کونسی بات استمراراً کی تھی اور کونسی ہنگامی حالات کے ماتحت) غالباً یہ حضرات خود کریں گے۔

۔ شیعانِ پاکستان کسی ایسے پرنسپل یا پبلک لا کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جس میں اہلِ تشیع کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حقوق کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔

ان حضرات کے نزدیک قدرِ مشترک صرف سنّت کا لفظ ہے۔ اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قوانین کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) شخصی قوانین ——— (PERSONAL LAWS)

(ب) ملکی قوانین ـــــــــــــــ (PUBLIC LAWS)

ہر چند کہ یہ تقسیم غیر قرآنی ہے تاہم شخصی قوانین ہر فرقے کے پہلے ہی الگ الگ ہیں. جہاں تک ان فرقوں کے دوسرے قوانین کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ قوانین "قرآن وسنت" کے عین مطابق ہے۔

۱۰۔ قرآنِ کریم اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دیتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں. قرآن کے اس دعوے کے بعد یہ تسلیم کرنا کہ یہ مختلف فرقوں کو ایسے قوانین دیتا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف اور باہمد گر متضاد ہیں، قرآن کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کے مرادف ہے۔ قرآن کو منجانب اللہ ماننے والا اس کا تصور تک نہیں کرسکتا کہ مختلف فرقوں میں سے ہر فرقہ کے قوانین کو قرآن کی تائید اور موافقت حاصل ہوسکتی ہے۔ بنا بریں اختلاف اگر موجود ہے تو اس کی بنیاد اگر قرآن نہیں تو "سنت" ہی ہوسکتی ہے کیونکہ "سنت" ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہے۔

۱۱۔ شخصی قوانین کی حد تک تو یہ اختلافی صورت نبھ سکتی تھی لیکن پبلک لاز تو ایسے نہیں ہوتے کہ ہر فرقہ کے لئے الگ الگ ہو۔ ان کا اطلاق مملکت کے تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ قرآن چونکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے اس لئے اگر شرط اتنی ہوتی کہ اسلامی قوانین کا قرآن کے مطابق ہونا لازمی ہے تو پبلک لاز کا ایسا ضابطہ نہایت آسانی سے مرتب ہوجاتا جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیتے لیکن جب اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کردی جائے کہ ان قوانین کا سنت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے تو کیا کوئی حکومت قرآن وسنت کی بنیاد پر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کرسکتی ہے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی قبول کرلیں۔

۱۲۔ انہیں اس کا اعتراف ہے کہ کتاب وسنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا جسے مختلف فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔

۱۳۔ طلوعِ اسلام نے شروع ہی میں اس دشواری کو سامنے لاتے ہوئے علماء حضرات سے درخواست کی تھی کہ :۔

(۱) آپ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کردیں جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہو۔

(۲) اگر آپ خود ایسا نہیں کرنا چاہتے تو "سنت" کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب کرکے حکومت کو دیدیں جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر قابلِ تسلیم ہو۔

۳۔ اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ناممکن ہے تو پھر "قرآن و سنّت" کی شرط سے "سنّت" کو حذف کردیں اور یہ مطالبہ کریں کہ حکومت ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب اور نافذ کردے جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔

۱۵۔ ہم ملک کے بہی خواہ اربابِ علم و بصیرت کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ بھی علماء حضرات سے یہی سوال کریں تاکہ ملک اس مسلسل خلفشار سے نجات حاصل کرسکے جو یہاں اسلام کے نام پر برپا کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی موجودگی میں نہ اسلامی نظام قائم ہوسکتا ہے نہ ہی قانونِ شریعت رائج کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کے مسلمان اگر فی الواقعہ چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اوّلاً مختلف فرقے اپنے موقف میں یہ تبدیلی پیدا کریں کہ وہ اپنی فقہ اور اپنے اپنے ہاں کی احادیث (روایات) پر جم کر بیٹھنے کے بجائے قرآن کریم کو سند اور حجت تسلیم کریں اور اس کی روشنی میں از سرِ نو قوانینِ شریعت کی تدوین کریں۔ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہوگا جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی قرار پاسکے گا اور ثانیاً ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جائے کہ ہماری آنے والی نسلیں، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، بریلوی کے بجائے صرف مسلم بن کر ابھریں۔

۱۶۔ یہ ہے قارئینِ محترم! ہماری اصل دشواری جس کا حل نہ شریعت بل میں مضمر ہے نہ فی سبیل اللہ ہنگامہ آرائیوں میں۔ یہ وہی مرضِ کہن ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اور وہ آبِ نشاط انگیز آج روئے زمین پر صرف اور صرف قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰:۵۷)

یہ وہی قانون ہے جو اب اے نوعِ انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے اس ضابطۂ حیات کی شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔ اس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔

اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ کوئی دوسرا طریق نہیں۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (۱۷:۹)

بے شک قرآن انسانیت کے سفرِ زندگی میں اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو

سب سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھی ہے۔

قائدِ اعظمؒ اور ماہنامہ الفجر کراچی

جنوری کے شمارے میں ہم نے ماہنامہ الفجر کراچی میں قائدِ اعظمؒ کے متعلق کہے گئے درج ذیل الفاظ کا نوٹس لیا تھا۔

"تحریکِ پاکستان کے دور میں انہوں (علماء) نے ایک ایسے شخص کو قائدِ اعظم تسلیم کر لیا جو کم از کم ایک اسلامی ریاست چلانے کا قطعاً اہل نہ تھا اور نہ اس کو اس بارے میں کوئی شعور اور علم تھا۔"

اب اسی جریدے کے مارچ ۹۴ء کے شمارہ میں "محترمہ بے نظیر بھٹو کے نام کھلا خط" کے عنوان سے شائع شدہ مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کی اسلام کے احیاء اور غلبہ سے وابستگی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے بھی اہلِ پاکستان کے لئے جو معاہدۂ عمرانی تجویز کیا ہے وہ اقبالؒ کے افکار اور نظریات سے مختلف نہیں۔ ان کے الفاظ ہیں۔

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی شخص یا ادارے کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی ہے جس کے لئے لامحالہ آپ کو الگ خطۂ زمین ضرور چاہیئے۔"

(۱۹۴۱ء عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

لا الٰہ الا اللہ کا اقرار سب سے بڑا معاہدہ عمرانی ہے جو مقتدرِ اعلیٰ اور انسانوں کے درمیان طے پاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تیار ہونے والے ضابطۂ حیات کو اسلام کہتے ہیں۔ یہ اقرار اللہ نے انسانی جبلت میں شامل کر دیا ہے اور نوعِ انسانی کی دنیا میں آمد سے قبل تمام ارواح سے توحیدِ باری کا حلف اٹھوایا گیا تھا۔ اس معاہدۂ عمرانی کی

موجودگی میں کسی نئے معاہدہ کی ضرورت کم ازکم ایک اسلامی ریاست کو درپیش نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی معاہدۂ عمرانی کے نفاذ کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ بقول قائد۔

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ صرف ایک خطۂ زمین حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔" (۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء اسلامیہ کالج پشاور)

"پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا تاکہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور سانس لے سکیں اور جہاں اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رو بہ عمل لائے جا سکیں۔" (۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء خالق دینا ہال کراچی)

"مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔"

(۲۱ نومبر ۱۹۴۸ء پشاور)

"میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں؟ اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی پیش نہیں کرسکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کار آمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے تھے۔" (۲۵ جنوری ۱۹۴۵ء سندھ بار)

"مغرب کے معاشی نظام نے نوعِ انسانی کے لئے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے ہم اپنا نصب العین یعنی عوام کی خوشحالی اور اطمینان کبھی حاصل نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ہمیں اپنا راستہ آپ تراشنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے وہ نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلام کے نوعِ انسانی کی مساوات اور عدلِ عمرانی کے تصور پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریقہ ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہوسکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے اور نوعِ انسان بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہوسکے۔ یہ سب کچھ

کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔" (یکم جولائی ۱۹۴۸ء اسٹیٹ بنک کراچی)

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ آئین کی تشکیل اور ضمنی قانون سازی کے لئے اسلامی اصولوں کو کافی سمجھتے تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے معاہدہ عمرانی کی نہیں بلکہ عدل عمرانی (سوشل جسٹس) کی ضرورت ہے جس کی کمی کی وجہ سے موجودہ سیاسی نظام بحران کا شکار ہے۔

علاقائیت اور مذہبی تعصب کے بارے میں قائداعظمؒ کا نقطۂ نظر ملحوظِ خاطر رہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ مسلمان صوبائی مرض کے اس تعصب کو دل سے دور کریں۔ یہ اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے لعنت ہے کہ ان کا ذہن ابھی تک سندھی، پنجابی، پٹھان اور دہلوی کے تنگ دائروں میں گھوم رہا ہے۔"

(۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء خطبہ عید میلاد النبیؐ)

"اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ سب اس بات پر مجھ سے متفق ہوں گے۔ ہم خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں آخر الامر مسلمان ہیں لہٰذا اگر آپ ایک ملت بننا چاہتے ہیں تو خدا کے لئے صوبجاتی تفریق کو خیرباد کہئے۔ صوبجاتی تفریق اور مذہبی فرقہ بندیاں شیعہ اور سنی وغیرہ لعنت ہیں۔" (۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء۔ ڈھاکہ)

طلوعِ اسلام

غنیمت ہے — یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

○

۱۶ فروری ۹۴ء کے روزنامہ نوائے وقت، لاہور کے ادارتی صفحہ کے کالم ۳ پر "مذہبی جماعتیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کریں" کے عنوان کے تحت اس ادارتی نوٹ میں لکھا گیا ہے کہ "سپاہِ صحابہ پنجاب کے سربراہ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی نے انتباہ کیا ہے کہ اگر سپاہِ صحابہ کے رہنماؤں اور کارکنوں کا قتلِ عام بند نہ کیا گیا، تو ملک میں خوفناک جنگ شروع ہو جائے گی۔ سپاہِ صحابہ پنجاب کے صدر مولانا سمیع الحق جھنگوی کے قاتلوں کو ۲۵ فروری تک گرفتار کر لیا جائے ورنہ حالات بگڑنے کی ذمہ داری حکمرانوں پر ہو گی۔"

اداریے میں لکھا گیا ہے کہ ہر مکتبۂ فکر طاقت کے زور پر اپنا نقطۂ نظر منوانا چاہتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ملک اور دین کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے اور ہماری فرقہ وارانہ آویزش قتل و غارت گری تک پہنچ گئی ہے اختلافات اتنے کشیدہ نہیں ہونے چاہئیں کہ عذاب بن جائیں۔ مختلف مذہبی جماعتوں پر ذمہ داری عائد

ہوتی ہے کہ وہ " فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کریں"۔

طلوعِ اسلام

وہ جن کا وجود ہی فرقہ دارانہ اختلافات پر منحصر ہے ان سے " فرقہ وارانہ ہم آہنگی " کی اپیل ؟ چہ خوب است۔ میر کیا سادہ ہیں ....

○

ماہنامہ " اسلامی انقلاب " لاہور کے جنوری ۹۴ء کے شمارے میں صفحہ ۳۴ پر مولوی ظفر احمد قادری صاحب نے قرآنی آیات کے ذریعے مختلف مشکلات اور مسائل کے حل کے لئے متعدد مجرب نسخے تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک تیر بہدف نسخہ ملاحظہ فرمائیے۔ جناب قادری صاحب رقمطراز ہیں کہ

> " اندرونی دشمنوں سے امن و عافیت حاصل کرنے کے لئے سورۃ القریش کی ۲۷ مرتبہ اور بیرونی دشمنوں سے نجات پانے کے لئے ۱۲۷ مرتبہ پڑھ کر متعلقہ جانب پھونک مار دی جائے تو اندرونی شورش پسند اور بیرونی دشمن ہلاک اور برباد ہو جائیں گے۔"

طلوعِ اسلام

مبارک ہو وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو کہ اندرونی شورشوں کو فرو کرنے اور بیرونی خطرات سے نپٹنے کے لئے ایک مجرب اور کارگر نسخہ روحانی ہاتھ لگ گیا ہے۔

○

ماہنامہ " الحق " اکوڑہ خٹک جو کہ ایک مشہور سیاستدان مولانا سمیع الحق کی زیر صدارت شائع ہوتا ہے کی دسمبر ۹۳ء کی اشاعت کے صفحہ آخر پر فرمانِ رسول کے زیر عنوان ایک روایت تحریر ہے کہ حضرت علیؓ ابنِ طالب کہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ " جب میری امت میں یہ چودہ خصلتیں پیدا ہو جائیں گی تو اس پر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہو جائیں گی۔" دریافت کیا گیا کہ وہ خصلتیں کون سی ہیں ؟ فرمایا:

۱) جب سرکاری مال و متاع کو ذاتی ملکیت بنا لیا جائے۔
۲) امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جائے۔
۳) زکوٰۃ جرمانہ محسوس ہونے لگے۔
۴) شوہر بیوی کا مطیع ہو جائے۔
۵) اولاد ماں کی نافرمان بن جائے۔
۶) آدمی دوستوں سے بھلائی کرے اور باپ پر ظلم ڈھائے۔

۷) مساجد میں شور مچایا جائے۔ (سپیکروں کے ساتھ؛ طلوعِ اسلام!)
۸) قوم کا رذیل ترین آدمی اس کا لیڈر بن جائے۔
۹) آدمی کی عزت اس کی بُرائی (بڑائی نہیں) کے ڈر سے ہونے لگے۔
۱۰) نشہ آور اشیاء کھلم کھلا استعمال کی جائیں۔
۱۱) مرد ریشمی اور ملائم لباس پہننے لگیں۔
۱۲) آلاتِ موسیقی کا استعمال کیا جائے۔
۱۳) رقص و سرود کی محفلیں سجائی جائیں۔
۱۴) اِس وقت کے لوگ، اگلوں پر لعن طعن شروع کر دیں۔

لوگوں کو چاہیئے کہ پھر وہ ہر وقت عذابِ الٰہی کے منتظر رہیں۔ خواہ وہ سرخ آندھی کی شکل میں آئے یا یا زلزلے کی شکل میں۔ (ترمذی۔ باب علامات الساعت)

طلوعِ اسلام

لگتا ہے اس حدیث کی ہر شق پاکستان کے موجودہ معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

جو قوم تسخیرِ فطرت کے لئے جدّ وجُہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتی ہے اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے حصول میں دوسرں کی محتاجگی، لعنت، ذلت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے

شہر آشوب

○

وہی شام وسحران کے وہی لیل ونہار اب تک
وہی ان کی خدائی ہے مرے پروردگار اب تک

وفورِ عیش و عشرت سے بھلا فرصت کہاں انکو   وہی نواب ہیں سردار ہیں با اختیار اب تک
وہ محتاجوں یتیموں اور بیواؤں کے والی ہیں
وہ مولا بے نواؤں کے بنے ہیں بار بار اب تک

غریبوں کی سیہ بختی کی مالا ہاتھ میں تھامے   وہ جپتے نام ہیں ان کا بڑے دیوانہ وار اب تک
کہ ان کے سحر میں ہیں سب سیہ خانوں کے زندانی
بحال اضطرار اب تک بچشمِ اعتبار اب تک

وہی ہاری، وہی کامی، غلام ابنِ غلام ان کے   ازل سے چاکری میں ہیں دمادم جاں سپار اب تک
انہیں بس دھن یہی ہے آخری دم تک رہیں حاکم
اسی دھن میں رہے ہیں وہ سراپا انتشار اب تک

کہاں بہبود کے نعرے کہاں راہیں ترقی کی   گرہ کھل جائے گر کوئی تو باندھیں صد ہزار اب تک
مسائل ہی مسائل سر اٹھاتے ہیں جدھر دیکھو
نہیں آیا کوئی رہوارِ ہمت پر سوار اب تک

کہ آنکھیں پک گئی ہیں راستہ تکتے ہوئے تیرا   مرے قائد تمہارا رات دن ہے انتظار اب تک
جوانوں کے لگے ہیں ٹھٹھ کے ٹھٹھ افتادہ راہوں میں
قطار اندر قطار اب تک، پریشاں روزگار اب تک

نہیں محفوظ چوروں، رہزنوں سے رہ گزر کوئی   وہ دہشت گرد آدم جو پھرے ہیں بے مہار اب تک
گزرگاہوں کو مقتل میں بدل دیتے ہیں دم بھر میں
کہاں قانون کی بستی کے ہیں والا تبار اب تک

کہاں ہیں محتسب معصوم جانوں کے وہ رکھوالے   کہاں کا خوابِ غفلت صاحبانِ اختیار اب تک

بجھی ہے علم کی قندیل، ہر جانب اندھیرا ہے
کہاں دانش گہِ عرفاں کے ہیں مردانِ کار اب تک
کہاں ہیں ذوق و شوق رہ نوردی کے مسافر سب تن آساں کیوں ہوئے فولاد کے مردِ کبار اب تک
کہاں خونِ شہیداں ہے عروسِ پاک کا غازہ
کہاں ہیں عصمتوں کے وہ گہر بیرونِ دیار اب تک
کہاں ایمان و نظم و ضبط کے معجز نما نعرے کہ ارضِ پاک کی جن سے بنا ہے استوار اب تک
مرے قائد کی روحِ پاک کو صدمے بہت پہنچے
سقوطِ شرق کے غم میں ہے لبِ دم بیقرار اب تک
دمادم سن رہا ہے دخترِ کشمیر کی چیخیں وہ جن کی آنچ سے ہیں آتشیں سرو و چنار اب تک
جوانانِ کشامر خون کے دریا کو پاٹے ہیں
ہے شہ رگ پنجۂ اغیار میں خونابہ بار اب تک
وہ ہمت کا علم لے کر ستیزہ کار نکلے ہیں شہادت گاہِ الفت میں قطار اندر قطار اب تک
مرے مولا دہائی ہے، محمدؐ کی دہائی ہے
غلامانِ محمدؐ ہیں سراپا خوں فشار اب تک

(غلام رسول ازہر)

تبصرۂ کتب

نام کتاب : احسن القصص مصنف : ایم بشیر احمد
ملنے کا پتہ : مکان ۲۳۳ گلی ۱۶ ، نبی پورہ آرائیاں باغبانپورہ ۔ لاہور ۔
ہدیہ : ۸/- روپے ۔

زیر تبصرہ کتاب اتنی مختصر ہے کہ اسے رسالہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ ادارہ تعلیم القرآن بالقرآن لاہور کی مطبوعات میں سے ایک دلچسپ مفید اور مؤثر اضافہ ہے۔ اس ادارہ نے قرآنِ کریم کے مضامین کا ایک سلسلہ " روشن روشن " کے نام سے شروع کیا جس میں قرآنِ حکیم کے واقعات کو قرآن ہی کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

اس رسالہ میں مختلف انبیاء کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کا جو تفصیلی ذکر قرآنِ مجید کی ایک ہی سورہ میں کیا گیا ہے اس کا اردو میں مفہوم بڑے احسن انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ بعض آیات کی توسین میں اس طرح توضیح کی گئی ہے کہ عبارت کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ان مقامات کی خصوصاً علیحدہ تشریح کی گئی ہے جہاں روایتی مفسرین نے اشکال پیدا کئے ہیں اور محترم ہستیوں پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

مصنف کا یہ نقطۂ نظر انتہائی قابلِ ستائش ہے کہ قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم نہیں لینا چاہیئے جس سے انبیاء کی سیرت و کردار کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوں کیونکہ قرآنِ مجید انبیاء کو مثالی انسانوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

یہ رسالہ قرآنی مضامین کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے اور عام قارئین کے لئے مفید اور دلکش انداز میں اسلامی تعلیمات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں قرآنِ مجید کا مفہوم روایتی انداز سے ہٹ کر بیان کیا گیا ہے اس لئے جدید تعلیمیافتہ طبقے کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

اس رسالہ کا کاغذ اور طباعت وغیرہ مناسب ہے اور ہدیہ معقول ہے۔

ثریا عندلیب

افکارِ اقبالؒ

سوال :- فقر سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

جواب :- فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں- بلکہ استغنا اور دولت سے بے پرواہی ہے- دولت جوہر مردانگی کی موت ہے- اس سے جرات اور بہادری جاتی رہتی ہے ۔

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا ○ تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

سوال :- آپ نے خدا کی حقیقت کو تسلیم کیسے کیا- جب کہ آپ عالم بھی ہیں اور فلسفی بھی- کیا آپ خدا کے وجود اور ہستی کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں؟

جواب :- اس کے لئے مجھے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں- میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبرؐ نے جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا- جب فرمایا ہے کہ خدا مجھ سے (بذریعہ وحی) ہم کلام ہوتا ہے تو خدا کی ہستی یقیناً ہے-

سوال :- امت کی بنیاد کس پر ہے-

جواب :- یہ جو ارشاد باری ہے- کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تو ثابت ہوا کہ امت کی بناء وطن کی بجائے عقیدے پر ہے اور عقیدے کا تقاضا تھا کہ حضورؐ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائیں- میثاق مدینہ نے عملاً اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی- وطن قومیت کی کوئی مستقل اساس نہیں ہے- عالم اسلام کب سے روبہ انحطاط ہے- نہ علم باقی رہا نہ عمل-

سوال :- عظیم المرتبت انسانوں' بڑے بڑے شاعروں اور قوموں کے رہنماؤں کی زندگی میں ان کی قدر لوگ کیوں نہیں کرتے؟

جواب :- تم غور کرو تو تم کو معلوم ہو گا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی بند ہوتی ہیں اور جب

شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ صدیوں تک اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہے۔

سوال :۔ مسلمان لڑکیوں میں مذہبی تعلیم کا شغف جو فطری طور پر ہونا چاہئے نہیں پایا جاتا۔ کیا کریں؟

جواب :۔ آپ مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس مذہب کی خوبیاں چالیس سال کی عمر کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ تمہارا کام تو زمین ہموار کرنا اور اس میں پودا لگانا ہے۔ یہ پودا ایک دن خود بخود تناور درخت بن جائے گا اور پھل لائے گا۔

سوال :۔ کیا فن برائے فن کا نظریہ خطرناک و مہلک ہوتا ہے؟

جواب :۔ اس نظریے سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیار صحت اور نصب العین مقرر کرے۔ اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول مثلاً اخلاقیات یا روحانیت کا کوئی اصول اس فن کی رہبری کا حق دار نہ ہو۔ میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا۔ فن جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے تو وہ جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے جمالیات کے کسی شعبہ کو لو گے تو وہ قوم و ملت میں ایک نئی روح پھونکے گا۔ لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا۔ تو قوم و ملت کے حق میں زہر قاتل بنے گا۔ ۔

دلبری بے قاہری جادوگری است ○ دلبری با قاہری پیغمبری است

سوال :۔ آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے محرکات کے بارے میں بتائیے۔

جواب :۔ آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے۔ جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے اس وقت تک آرٹ زندہ اور جاندار رہتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ تو ٹھوس چیزوں کے 'مغز سے' معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ چھلکے سے' شکل سے دل بستگی بڑھ جاتی ہے۔ یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے۔ آرٹ کی عظمت کا انحصار شکل پر نہیں بلکہ مغز پر ہے۔ یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔

میرا عقیدہ ہے۔ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے۔ اس بناء پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں۔ نہ کہ محض آلہ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی

بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔

سوال :- بعض لوگ تھوڑے سے وقت میں بہت سی کتابیں کیسے پڑھ لیتے ہیں؟

جواب :- اصل بات یہ ہے کہ جب انسان کا مطالعہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ تو وہ بہت سی باتوں کو جو بار بار دہرائی جاتی ہیں اور جنہیں پڑھنا غیر ضروری ہوتا ہے نظرانداز کرتا چلا جاتا ہے اور صرف وہی حصے پڑھتا ہے جن میں کوئی نئی بات بیان کی گئی ہو۔ ایسی کتاب تو کہیں صدیوں میں لکھی جاتی ہے۔ جو شروع سے آخر تک اس طرح بالاستیعاب پڑھنے کے لائق ہو کہ اس کا ایک لفظ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

سوال :- میرے یہ دوست خدا کے وجود سے منکر ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں۔

جواب :- (مسکرا کر) جسے خدا نہ سمجھا سکا۔ اسے میں کیا سمجھاؤں گا۔

سوال :- انسان مجبور محض ہے یا اسے کچھ اختیار بھی حاصل ہے؟

جواب :- اس قسم کے طرز خیال سے انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔ قوموں کے زوال میں اس قسم کے خیالات کو خوب خوب فروغ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اس قسم کے خیالات ہیں کہ جن کی اشاعت قوموں کے زوال و انحطاط کا سبب بنتی ہے۔ وہ چیز جسے ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا ذمہ دار کون ہے! کیا شیطان؟ لیکن مجھے تو یہ گوارا نہیں کہ اپنے گناہوں کی ذمہ داری شیطان پر رکھوں۔ شیطان کے وجود کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں۔ ہم پر گناہوں سے بچنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ شیطان بھی گناہوں کی ذمہ داری انسان پر ڈالتا ہے۔ شیطان بھی تو گناہوں سے بیزار رہتا ہے۔

مفلسی اور غریبی کے بارے میں علامہ کے رشحات

مفلسی کا آزار انسان کے روحانی قوا کا دشمن ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو جائے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں۔ اسلام غربت کو ایک برائی سمجھتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کی مجلی آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے۔

طلبہ کو ہدایت

طلبہ کو چاہئے کہ پہلے علم حاصل کریں۔ اس لئے کہ بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ ایک موقع پر صوفی تبسم سے کہا۔ میں زیادہ موزوں لفظ چاہتا ہوں۔ ایک ایسے دفاع کے لئے تشبیہ کی ضرورت ہے۔

جس کا ظاہر عارضی طور پر شگفتہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے اندر گندگی بھری ہوتی ہے۔ ایک رباعی لکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لفظ کی تلاش ہے۔ ہماری قوم کے اکثر اصحاب فکر کے دماغوں کی یہی کیفیت ہے۔ تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت، بے جگری اور بے مثال سرفروشی کے بارے میں علامہ ـــ فرمایا۔

"مسلمان ایک ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرتا ہے اسے پاش پاش کرتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ **الشداء علی الکفار**

سوال:۔ حاکمیت اور محکومیت کا قوموں کے کردار پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب:۔ خدا جب فرد یا قوم کو حکومت سونپتا ہے تو وہ انہیں موقع دیتا ہے کہ اپنی سیرت میں ایک خاص قسم کے تدبر، عدل اور اخلاق کے اوصاف پیدا کریں۔ چونکہ مروت، علوہمت، فراخ دلی، مردم شناسی اور فیض و سخاوت کی اعلیٰ خصوصیات کے بغیر ایک شخص صحیح طور پر حکمران (سربراہ مملکت) بن ہی نہیں سکتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ خدا نے حاکمیت میں تعمیر کردار اور تربیت سیرت کے جو مواقع رکھے ہیں وہ محکومیت میں نہیں ہیں۔

سوال:۔ عجیب بات ہے کہ اب تک خلاء میں روشنی سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز دریافت نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی بجائے خود طبیعاتی نقطۂ نظر سے قادر مطلق ہے؟

جواب:۔ کیا تمہیں قرآن کی وہ آیت یاد نہیں **اللہ نور السموت والارض** اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ دوسرے موقع پر فرمایا اب سائنس دانوں پر وہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے جس کو قرآن کریم نے مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے۔ **ان اللہ علی کل شی قدیر** بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

قرآن کی کاملیت کے متعلق فرمایا۔ ایک مدت سے ہم سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں۔ ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتی۔

شاہ ولی اللہ کے بارے میں۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب حکومت اور عمل داری کی طرح قوائے علم و عمل بھی ماؤف ہو رہے تھے اور لوگوں کو دلچسپی تو بیشتر چند فرسودہ اور لاحاصل بحثوں سے تھی۔ شاہ صاحب کا سیاست اور معاش پر قلم اٹھانا ایک حیرت انگیز امر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری نشاۃ ثانیہ کے نقیب ہیں۔ **حجتہ اللہ البالغہ منجملہ** ان تصنیفات کے ہے جنہوں نے مسلمانوں کے

ضرورت اس امر کی ہے کہ شاہ صاحب نے سیاست اور معاش کے بارے میں جن
دل و دماغ کی رہنمائی کی۔
خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی ترجمانی دور حاضر کی رعایت سے کی جائے۔
مسلمانوں کی تباہی ایک جز کی تباہی تھی۔ امت
اندلس اور مغلیہ ہند کی تباہی۔ فرمایا اندلس اور مغلیہ ہند میں
کا وجود تو بہرحال قائم ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ قومیں پیدا بھی ہوتی ہیں اور مر بھی جاتی ہیں۔ قرآن پاک کا بھی
ہی فیصلہ ہے۔ (لکل امتہ اجل) قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مرجاتی ہیں۔ یہ ایک آسان سی بات ہے جو سمجھ میں
آ جاتی ہے۔ لیکن بعض امتوں میں یہ بھی تو ہوتا ہے کہ قوم کی ہستی تو قائم رہتی ہے۔ لیکن بظاہر یوں نظر آتا
ہے جیسے کہ اس کا وجود ختم ہو گیا۔ حالانکہ صورت یہ ہوتی ہے کہ بہ سبب زوال و انحطاط اس کے قوائے علم و
عمل مردہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس حالت کو بھی موت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ موت زندگی سے بدل
سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنے اندر ذات میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کریں۔ یعنی اس مقام پر واپس آ جائیں جس سے
ہم چلے تھے۔ یاد رکھو! دنیا کی کوئی قوم اپنا اصول قومیت چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ موت اس وقت وارد ہوتی
ہے۔ جب قومیں اپنے اصول زندگی سے منحرف ہو جائیں۔ عالم اسلام' اسلام کی بدولت وجود میں آیا۔ اس کی
ہستی اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام ہی کی بدولت اس میں پھر زندگی پیدا ہو گی۔ قانون قدرت یہ ہے کہ اگر
کسی قوم کو زندگی کی آرزو ہے تو اسے زندگی دی جائے۔ زندگی اس ایمان کی بدولت ملتی ہے کہ ہماری کوئی
حقیقت ہے۔ اسلام بھی ایک حقیقت ہے۔ اور یہ حقیقت ہمیشہ قائم رہے گی۔ لہٰذا باوجود زوال و انحطاط عالم
اسلام ہی پھر زندہ ہو گا اور ضرور ہو گا۔

اقبالؒ کے تصور کا انسان۔ فرمایا فرد انسانی طاقت' توانائی اور ارادے کی اکائی ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی ہے
جس کے پاس بے انتہا طاقت ہے اور اس طاقت کو بتدریج روبہ ظہور لانا ہی انسانی سرگرمیوں کا منشاء ہے۔ اس
تصور کے مطابق انسان کا جوہر اصلی ارادہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مطلوبہ نصب العین انسانی ارادے کی تربیت
ہے۔

حوالہ جات (روز گار فقیر۔ سرگزشت اقبالؒ۔ اقبالؒ کے حضور۔ ملفوظات اقبال۔ اقبال کے زریں افکار علم۔ علم
کا ------ در مکالمات اقبال)

عبداللہ (بنگلور)

اُٹھ باندھ کمر کچھ کر کے دکھا

میزبان رسولؐ، حضرت ایوب انصاریؓ کو دیکھئے' پیرانہ سالی کے باوجود قسطنطینہ کے محاذ پر کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سالمؓ جن کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرماتے ہیں "آج اگر سالمؓ ہوتے تو مجلس شوریٰ کی ضرورت نہ تھی" یہی سالمؓ میدان جہاد میں دکھائی دیتے ہیں تو اس حالت میں کہ دونوں ہاتھ جسم سے الگ ہو چکے ہیں لیکن اس پر بھی دست بریدہ بازوں کا حلقہ بنائے پرچم اسلام کو سربلند رکھے ہوئے ہیں۔ کیا انہیں " لکم دینکم و لی الدین " کی تفسیر کرنا نہ آتی تھی؟ ان ماؤں پر نگاہ ڈالئے جنھوں نے اپنی آغوش کے پرورده شیر دل نوجوان عظمت اسلام پر نچھاور کرتے وقت اف تک نہ کی۔ ان بیبیوں کو ذہن میں لائیے جو اپنے خاوندوں سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ میدان جہاد میں کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہ دے پائے اور پھر اللہ کے ان وعدوں کا احاطہ کیجئے جو اس دور میں ایک ایک کر کے پورے ہوئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد جب تک قائم رہا خلافت ارضی انہیں حاصل رہی۔ لیکن جب حق کی سربلندی میں پیش آنے والی سختیوں سے دل گھبرانے لگے تو عام مسلمان تو ایک طرف، پیشوایان مذہب اور راہبران ملت نے بھی الاماشا اللہ "باغبان بھی خوش رہے' راضی رہے صیاد بھی " والی پالیسی اختیار کر لی۔ علماء دین جن سے اصلاح کی توقع تھی وہ علمی موشگافیوں میں مصروف ہو گئے۔ کہیں تسبیح و تہلیل کے فلسفے وجود پذیر ہوئے تو کہیں رموز و اوقاف کے قواعد وضع کئے جانے لگے۔ عسکری تربیت گاہوں کی جگہ آثار و میلاد کی محفلیں جمنے لگیں۔ علم تصوف نے سر اٹھایا حالانکہ تیسری صدی ہجری تک مسلمان اس فلسفہ حیات سے قطعاً" واقف نہ تھا۔ یونان اور ہندوستان فتح ہوئے تو ان تہذیبوں سے متاثر مفکرین نے کچھ یونانی فلسفے سے لیا اور کچھ سرزمین ہند کے زنار پوشوں کی عبادت گاہوں سے اخذ کر کے بڑی ہی معصومیت سے اس یکسر نئے فلسفے کو دین اسلام کا حصہ بنا دیا اور اس طرح جذبہ جہاد سے سرشار قوم میدان کارزار سے منہ موڑ کر ذات حق کی ضربات

اور صفات حق کے مراقبات میں محو ہو گئی۔ ادھر ترک حیوانات ترک مباہات، ترک علائق کی اختراعات نے جنم لیا اور ادھر لب بند، نظر بند، گوش بند کے مجاہدے اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی مشقیں کرائی جانے لگیں اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کورس کی تکمیل پر آج بھی عالم ملکوت، عالم لاہوت اور عالم جبروت کی سیر کے "ویزے" جاری کئے جاتے ہیں۔ اس فلسفے کی کامیابی کے لئے مشائخین اور سجادہ نشینوں نے افراد امت کے دل و دماغ میں استعانت باللہ کی قرآنی تعلیم کی جگہ استعانت بالاولیاء کا تصور پیوست کر دیا۔ سمع موتی اور "روحیں قبر سے تعلق رکھتی ہیں" جیسے اعتقادات پیدا کر کے مرحوم بزرگوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اس سے بھی آگے قدم بڑھایا تو زندہ لوگوں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کا فریضہ بھی انہی کے سپرد کر دیا۔ اب حصول روزگار ہو یا حصول اولاد، صاحب مزار کی عنایت ہو تو سب کام آسان۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہی افکار "علیکم سنتی و سنت خلفائے راشدین" کی پیروی ہے اور یہی کردار "ما انا علیہ و اصحابی" کی تکمیل ہے تو نظر آتا ہے کہ اسابقون الاولون نے تو شاید (نعوذ باللہ) دین کو سمجھا ہی نہ تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ دستار فضیلت باندھ کر مذہبی درسگاہوں سے برامد ہونے والے روایتی عالموں کی فوج ظفر موج، جس کی رگوں میں بھیک اور چندے کا پیدا کردہ خون دوڑ رہا ہے، کے بس میں ہی نہیں کہ وہ قرآن کریم کے پیش کردہ مجاہدانہ کردار کو سمجھ سکے۔ آج کشمیر، بوسنیا اور فلسطین میں ہمارے نوجوانوں اور بوڑھوں کی روحیں پکار رہی ہیں کہ کاش ہم مجاہدین کے باپ، بھائی اور بیٹے ہوتے تو یوں ہماری لاشیں خاک و خون میں نہ تڑپتیں۔ عصمت ماب عورتوں کی روحیں چیخ رہی ہیں کہ کاش ہم مومنین کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہوتیں تو یوں ہماری عصمتیں پامال نہ ہوتیں۔ ہماری دوشیزائیں نوحہ کناں ہیں کہ کاش ہم محض واعظین اور مبلغین کی بہو بیٹیاں نہ ہوتیں کہ یوں ہم بے آبرو نہ ہوتیں۔ بچوں کی روحیں حسرت و یاس کی تصویر بنی بیٹھی ہیں کہ کاش ہم مشائخین اور سجادہ نشینوں کی اولاد نہ ہوتے تو یوں ہمیں ہماری ماؤں کی گود سے چھین کر نیزوں پر نہ اچھالا جاتا۔

دوسری طرف طاغوتی طاقتیں مسلسل اس پروگرام پر عمل پیرا ہیں کہ اس قوم کے دانا، محقق، مبلغ روایات میں الجھ کر اسلام کے بخیئے ادھیڑتے رہیں۔ شرح حدیث میں بال کی کھال کھینچتے رہیں۔ علم الکلام، علم المنطق، علم الفلسفہ، علم البدیع جیسے علوم میں اپنی زندگیاں صرف کرتے رہیں یا پھر ایک دوسرے پر تنقید اور تبصرہ میں مصروف رہیں۔ مقلد اور غیر مقلد کی گتھیاں سلجھاتے رہیں۔ رفع یدین اور آمین بالجہر پر بحث کرتے رہیں۔ فاتحہ اور لافاتحہ میں الجھے رہیں۔ جھاڑ پھونک کی دکانیں کھولے رہیں۔ عرس و سماع میں مشغول رہیں یا مرثیہ خوانی کرتے رہیں۔ مختلف رنگوں کی اوڑھنیاں اوڑھے مستورات کے جھرمٹ میں طبلہ کی تھاپ پر "آیا بنا آیا ہریالہ بنا آیا" کی محفلیں سجاتے رہیں تاکہ یہ قوم اللہ کے عطا کردہ دین سے بیگانہ رہے۔ نہ زمین کی وارث

سکے اور نہ ہی خلیفہ الارض کا کردار ادا کر سکے۔ حالانکہ ایک مرد مومن کا فریضہ زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظام خداوندی (جو صرف قرآن میں محفوظ ہے) کے قیام کے لئے جی جان سے جدوجہد کرے۔۔ وہ جس مقام پر بھی ہو اپنی جدوجہد کا آغاز کر دے۔ اس کی پہلی کوشش یہی ہو کہ تمام باطل (غیر قرآنی) نظامہائے حیات اور تصورات زندگی ختم ہو جائیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون اور اس کے عطا کردہ نظام زندگی (قرآن) ہی کا بول بالا ہو۔ اللہ کی مخلوق' غیر اللہ کی محکومی اور غلامی سے نکل کر صرف اللہ کی محکوم بن جائے۔

مومن صرف کھانے' پینے' کمانے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کر کے مرجانے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ و جاری کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔

کیا آپ کو اپنا یہ مقصد زندگی یاد ہے؟

(مضمون کی ترتیب میں ردو بدل کے لئے ہم صاحب مضمون سے معذرت خواہ ہیں)

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

عدل

تم نے اُونٹ یا گدھے پر بوجھ لدا دیکھا ہو گا۔ اگر اس کے دونوں طرف برابر برابر بوجھ ہو، تو سامان بھی ٹھیک رہے گا اور جانور بھی آسانی سے چلے گا۔ اسے عدل کہتے ہیں۔

عدل یعنی ایسا بوجھ جس میں دونوں طرفیں بالکل ایک جیسی ہوں، نہ کسی طرف جھکا ہوا نہ کسی طرف سے اٹھا ہوا۔

لہٰذا ایسا فیصلہ جس میں نہ کسی کی رعایت کرکے اسے زیادہ دیا جائے اور نہ کسی پر زیادتی کرکے اس کے حق میں کمی کر دی جائے عدل کہلاتا ہے۔ یعنی ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا اور ہر ایک کو اس کا حق دے دینا۔ قرآن شریف نے اس کی بڑی تاکید کی ہے۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز
(۵/۸)

"ہمیشہ عدل کرو کیونکہ عدل کرنے سے انسان خدا کے قانون کے مطابق چلتا ہے"۔

دشمن سے بھی عدل صرف اپنوں کے ساتھ ہی عدل نہیں بلکہ جن لوگوں کے ساتھ تمہاری دشمنی ہو ان سے بھی ہمیشہ عدل کرو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا قف هُوَ

اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۚ (۵/۸)

" دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ یہی چیز قانونِ خداوندی کے مطابق ہے۔"

نوٹ :-

عدل اور انصاف کا تعلق صرف عدالتوں ہی سے نہیں۔ آپ دوسروں کے ساتھ جس قدر معاملات کرتے ہیں ان میں آپ کے لئے عدل کرنا نہایت ضروری ہے۔ عدل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

◎

ہمارے جمہوریت پرست اور اسلام نواز احباب نے جس طرح اس گمراہی کو فروغ دینے کی سعی مذموم شروع کر رکھی ہے کہ جمہوریت اسلام کا مترادف ہے اسی طرح اس غلط فہمی کو بھی ایک عرصہ میں عوام کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جمہوریت آمریت و ملوکیت کی ضد ہے۔ حالانکہ یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جمہوریت ملوکیت و آمریت ہی کا ایک خوش رنگ نقابِ رخ ہے اور اب تو یہ نقاب اس قدر بوسیدہ ہو چلا ہے کہ اس سے ملوکیت و آمریت کا بھیانک چہرہ جھانکنے لگا ہے اور نقاب اٹھانے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اربابِ ہوش پر آشکار ہو چکا ہے کہ غوغائے جمہوری کی حقیقت سراسر شر ہے اور یہ سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کے سوا اور کچھ نہیں۔

(الفجر جون ۹۳ء ص ۲۵)

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r).
(BOOKS OF ALLAMA GHULAM AHMED PA RWEZ AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THESE PLACES)

1. **BIRMINGHAM**
229 Allum Rock Road
Birmingham
On every Sun at 15.00 hrs.

2. **CANADA**
716 The west Mall, Etobicock, ONT
Phone (416)245-5322
On 1st Sun at 11.00 hrs.

3. **DENMARK**
Julius Valentiners 25, 2.th.
2000 Frederiksberg V
Ph. 38346534
On last Sat at 19.00 hrs.

4. **ESSEX**
50 Arlington Road, Southend-on-Sea, Essex SS2 4UW
Phone: 0702-618819
On 2nd Sun at 15.00 hrs.

5. **KUWAIT**
Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain
Ph.5316273
On every Fri at 18.15 hrs.

6. **LONDON**
76 Park Road, Illford Essex
Phone: 081-553-1896
On 1st Sun at 14.30 hrs.

7. **NORWAY**
Akeberg Veien-56, Olsò 6
Galgeberg, 4th floor.
On 1st Sun at 16.00 hrs.

8. **YARDLEY**
633 Church Road, Yardley,
Birmingham B33 8HA
Phone 021-628-3718
On last Sun at 14.00 hrs.

9. **YORKSHIRE**
Cardigan Community Centre
145-49 Cardigan Road Leeds-6
Phone 0532-306140
On 1st Sun at 15.00 hrs.

something of a crossroads in their relations. We must not let them stand apart. I do not accept the argument that they are on course to clash in a new era of antagonism. I am utterly convinced that our two worlds have much to offer each other. We have much to do together. I am delighted that the dialogue has begun, both in Britain and elsewhere. But we shall need to work harder to understand each other, to drain out any poison between us, and to lay the ghost of suspicion and fear. The further down that road we can travel, the better the world that we shall create for our children and for future generations.

European, so the heart transplant surgeon in Britain may be Egyptian.

If this need for tolerance and exchange is true internationally, it applies with special force within Britain itself. Britain is a multi-racial and multi-cultural society. I have already mentioned the size of our own Muslim communities who live throughout Britain, both in large towns like Bradford and in tiny communities in places as remote as Stornaway in Western Scotland. These people, ladies and gentlemen, are an asset to Britain. They contribute to all parts of our economy - to industry, the public services, the professions and the private sector. We find them as teachers, as doctors, as engineers and as scientists. They contribute to our economic well-being as a country, and add to the cultural richness of our nation. Of course, tolerance and understanding must be two-way. For those of us who are not Muslim, that may mean respect for the daily practice of the Islamic faith and a decent care to avoid actions which are likely to cause deep offence. For the Muslims in our society, there is the need to respect the history, culture and way of life of our country, and to balance their vital liberty to be themselves with an appreciation of the importance of integration in our society. Where there are failings of understanding and tolerance, we have a need, on our own doorstep, for greater reconciliation among our own citizens. I hope we shall all learn to demonstrate this as understanding between these communities grows. I can only admire, and applaud, those men and women of so many denominations who work tirelessly, in London, South Wales, the Midlands and elsewhere, to promote good community relations. The Centre for the Study of Islam and Christian-Muslim Relations in Birmingham is one especially notable and successful example. We should be grateful, I believe, for the dedication and example of all those who have devoted themselves to the cause of promoting understanding.

Ladies and gentlemen, if, in the last half hour, your eyes have wandered up to the marvellous allegory of Truth descending on the arts and sciences in Sir Robert Streeter's ceiling above you, I am sure you will have noticed Ignorance being violently banished from the arena - just there in front of the organ casing. I feel some sympathy for Ignorance, and hope I may be permitted to vacate this theatre in a somewhat better condition... Before I go, I cannot put to you strongly enough the importance of the issues which I have tried to touch on so imperfectly this morning. These two worlds, the Islamic and the Western, are at

environment, are global in their causes and effects, and none of us any longer has the luxury of being able to solve them on our own. The Islamic and Western worlds share problems common to us all: how we adapt to change in our societies, how we help young people who feel alienated from their parents or their society's values, how we deal with Aids, drugs, and the disintegration of the family. Of course, these problems vary in nature and intensity between societies. The problems of our own inner cities are not identical to those of Cairo or Damascus. But the similarity of human experience is considerable. The international trade in hard drugs is one example; the damage we are collectively doing to our environment is another. We have to solve these threats to our communities and our lives together. Simply getting to know each other can achieve wonders. I remember vividly, for instance, taking a group of Muslims and non-Muslims some years ago to see the work of the Marylebone Health Centre in London, of which I am Patron. The enthusiasm and common determination that shared experience generated was immensely heart-warming. Ladies and gentlemen, somehow we have to learn to understand each other, and to educate our children - a new generation, whose attitudes and cultural outlook may be different from ours - so that they understand too. We have to show trust, mutual respect and tolerance, if we are to find the common ground between us and work together to find solutions. The community enterprise approach of my own Trust, and the very successful Volunteers Scheme it has run for some years, show how much can be achieved by a common effort which spans classes, cultures and religions. The Islamic and Western world can no longer afford to stand apart from a common effort to solve their common problems. One excellent example of our two cultures working together in a common cause is the way in which the Kingdom of Saudi Arabia is working with Oxford University to set up a research centre into Schizophrenia for an organization called SANE, of which I am Patron. Nor can we afford to revive the territorial and political confrontations of the past. We have to share experiences, to explain ourselves to each other, to understand and tolerate - and I know how difficult these things are - and build on those positive principles which our two cultures have in common. That trade has to be two-way. Each of us needs to understand the importance of conciliation, of reflection - TADABBUR is the word, I believe - to open our minds and unlock our hearts to each other. I am utterly convinced that the Islamic and the Western worlds have much to learn from each other. Just as the oil engineer in the Gulf may be

metaphysical and unified view of ourselves and the world around us. At the core of Christianity there still lie n integr view of the sanctity of the world, and a clear sense of the tr teeship an esponsibility given to us for our natural surroundings. In the word of that marvellous seventeenth century poet and hymn writer, George Herbert:

"A man that looks on glass,
On it may stay his eye;
Or if he pleaseth, through it pass,
And then the heaven espy."

But the West gradually lost this integrated vision of the world with Copernicus and Descartes and the coming of the scientific revolution. A comprehensive philosophy of nature is no longer part of our everyday beliefs. I cannot help feeling that, if we could now only rediscover that earlier, all-embracing approach to the world around us, to see and understand its deeper meaning, we could begin to get away from the increasing tendency in the West to live on the surface of our surroundings, where we study our world in order to manipulate and dominate it, turning harmony and beauty into disequilibrium and chaos. It is a sad fact, I believe, that in so many ways the external world we have created in the last few hundred years has come to reflect our own divided and confused inner state. Western civilisation has become increasingly acquisitive and exploitative in defiance of our environmental responsibilities. This crucial sense of oneness and trusteeship of the vital sacramental and spiritual character of the world about us is surely something important we can relearn from Islam. I am quite sure some will instantly accuse me, as they usually do, of living in the past, of refusing to come to terms with reality and modern life. On the contrary, ladies and gentlemen, what I am appealing for is a wider, deeper, more careful understanding of our world; for a metaphysical as well as material dimension to our lives, in order to recover the balance we have abandoned, the absence of which, I believe, will prove disastrous in the long term. If the ways of thought found in Islam and other religions can help us in that search, then there are things for us to learn from this system of belief which I suggest we ignore at our peril.

Ladies and gentlemen, we live today in one world, forged by instant communications, by television, by the exchange of information on a scale undreamed of by our grandparents. The world economy functions as an inter-dependent entity. Problems of society, the quality of life and the

modern Western world. Not only did Muslim Spain gather and preserve the intellectual content of ancient Greek and Roman civilisation, it also interpreted and expanded upon that civilisation, and made a vital contribution of its own in so many fields of human endeavour - in science, astronomy, mathematics, algebra (itself an Arabic word), law, history, medicine, pharmacology, optics, agriculture, architecture, theology, music. Averroes and Avenzoor, like their counterparts Avicenna and Rhazes in the East, contributed to the study and practice of medicine in ways from which Europe benefitted for centuries afterwards.

Islam nurtured and preserved the quest for learning. In the words of the tradition, "the ink of the scholar is more sacred than the blood of the martyr". Cordoba in the 10th century was by far the most civilised city of Europe. We know of lending libraries in Spain at the time King Alfred was making terrible blunders with the culinary arts in this country. It is said that the 400,000 volumes in its ruler's library amounted to more books than all the libraries of the rest of Europe put together. That was made possible because the Muslim world acquired from China the skill of making paper more than four hundred years before the rest of non-Muslim Europe. Many of the traits on which modern Europe prides itself came to it from Muslim Spain. Diplomacy, free trade, open borders, the techniques of academic research, of anthropology, etiquette, fashion, various types of medicine, hospitals, all came from this great city of cities. Mediaeval Islam was a religion of remarkable tolerance for its time, allowing Jews and Christians the right to practise their inherited beliefs, and setting an example which was not, unfortunately, copied for many centuries in the West. The surprise, ladies and gentlemen, is the extent to which Islam has been a part of Europe for so long, first in Spain, then in the Balkans, and the extent to which it has contributed so much towards the civilisation which we all too often think of, wrongly, as entirely Western. Islam is part of our past and our present, in all fields of human endeavour. It has helped to create modern Europe. It is part of our own inheritance, not a thing apart.

More than this, Islam can teach us today a way of understanding and living in the world which Christianity itself is the poorer for having lost. At the heart of Islam is its preservation of an integral view of the Universe. Islam - like Buddhism and Hinduism - refuses to separate man and nature, religion and science, mind and matter, and has preserved a

have commonly come to see as the threat of Islamic fundamentalism. We need to be careful of that emotive label, "fundamentalism", and distinguish, as Muslims do, between revivalists, who choose to take the practice of their religion most devoutly, and fanatics or extremists who use this devotion for political ends. Among the many religious, social and political causes of what we might more accurately call the Islamic revival is a powerful feeling of disenchantment, of the realisation that Western technology and material things are insufficient, and that a deeper meaning to life lies elsewhere in the essence of Islamic belief.

At the same time, we must not be tempted to believe that extremism is in some way the hallmark and essence of the Muslim. Extremism is no more the monopoly of Islam than it is the monopoly of other religions, including Christianity. The vast majority of Muslims, though personally pious, are moderate in their politics. Theirs is the "religion of the middle way". The Prophet himself always disliked and feared extremism. Perhaps the fear of Islamic revivalism which coloured the 1980's is now beginning to give way in the West to an understanding of the genuine spiritual forces behind this groundswell. But if we are to understand this important movement, we must learn to distinguish clearly between what the vast majority of Muslims believe and the terrible violence of a small minority among them - like the men in Cairo yesterday - which civilized people everywhere must condemn.

Chancellor, ladies and gentlemen, if there is much misunderstanding in the West about the nature of Islam, there is also much ignorance about the debt our own culture and civilisation owe to the Islamic world. It is a failure which stems, I think, from the straightjacket of history which we have inherited. The mediaeval Islamic world, from Central Asia to the shores of the Atlantic, was a world where scholars and men of learning flourished. But because we have tended to see Islam as the enemy of the West, as an alien culture, society and system of belief, we have tended to ignore or erase its great relevance to our own history. For example, we have underestimated the importance of 800 years of Islamic society and culture in Spain between the 8th and 15th centuries. The contribution of Muslim Spain to the preservation of classical learning during the Dark Ages, and to the first flowerings of the Renaissance, has long been recognised. But Islamic Spain was much more than a mere larder where Hellenistic knowledge was kept for later consumption by the emerging

states. Another obvious Western prejudice is to judge the position of women in Islamic society by the extreme cases Yet Islam is not a monolith and the picture is not simple. Remember, if you will, that Islamic countries like Turkey, Egypt and Syria gave women the vote as early as Europe did its women - and much earlier than in Switzerland! In those countries women have long enjoyed equal pay, and the opportunity to play a full working role in their societies. The rights of Muslim women to property and inheritance, to some protection if divorced, and to the conducting of business, were rights prescribed by the Qur'an fourteen hundred years ago, even if they were not everywhere translated into practice. In Britain at least, some of these rights were novel even to my grandmother's generation! Benazir Bhutto and Begum Khaleda Zia became prime ministers in their own traditional societies when Britain had for the first time ever in its history elected a female prime minister. That, I think, does not necessarily smack of a mediaeval society. Women are not automatically second-class citizens because they live in Islamic countries. We cannot judge the position of women in Islam aright if we take the most conservative Islamic states as representative of the whole. For example, the veiling of women is not at all universal across the Islamic world. Indeed, I was intrigued to learn that the custom of wearing the veil owed much to Byzantine and Sassanian traditions, nothing to the Prophet of Islam. Some Muslim women never adopted the veil, others have discarded it, others - particularly the younger generation - have more recently chosen to wear the veil or the headscarf as a personal statement of their Muslim identity. But we should not confuse the modesty of dress prescribed by the Qur'an for men as well as women with the outward forms of secular custom or social status which have their origins elsewhere.

We in the West need also to understand the Islamic world's view of us. There is nothing to be gained, and much harm to be done, by refusing to comprehend the extent to which many people in the Islamic world genuinely fear our own Western materialism and mass culture as a deadly challenge to their Islamic culture and way of life. Some of us may think the material trappings of Western society which we have exported to the Islamic world - television, fast-food, and the electronic gadgets of our everyday lives - are a modernising, self-evidently good, influence. But we fall into the trap of dreadful arrogance if we confuse "modernity" in other countries with their becoming more like us. The fact is that our form of materialism can be offensive to devout Muslims - and I do not just mean the extremists among them. We must understand that reaction, just as the West's attitude to some of the more rigorous aspects of Islamic life needs to be understood in the Islamic world. This, I believe, would help us understand what we

I have highlighted this particular example because it is so avoidable. Elsewhere, the violence and hatred are more intractable and deep-seated, as we go on seeing every day to our horror in the wretched suffering of peoples across the world - in the former Yugoslavia, in Somalia, Angola, Sudan, in so many of the former Soviet Republics. In Yugoslavia the terrible sufferings of the Bosnian Muslims, alongside that of other communities in that cruel war, help keep alive many of the fears and prejudices which our two worlds retain of each other. Conflict, of course, comes about because of the misuse of power and the clash of ideals, not to mention the inflammatory activities of unscrupulous and bigoted leaders. But it also arises, tragically, from an inability to understand, and from the powerful emotions which, out of misunderstanding, lead to distrust and fear. Ladies and gentlemen, we must not slide into a new era of danger and division because governments and peoples, communities and religions, cannot live together in peace in a shrinking world.

It is odd, in many ways, that misunderstandings between Islam and the West should persist. For that which binds our two worlds together is so much more powerful than that which divides us. Muslims, Christians - and Jews - are all "peoples of the Book". Islam and Christianity share a common monotheistic vision: a belief in one divine God, in the transience of our earthly life, in our accountability for our actions, and in the assurance of life to come. We share many key values in common: respect for knowledge, for justice, compassion towards the poor and underprivileged, the importance of family life, respect for parents. "Honour thy father and thy mother" is a Quranic precept too. Our history has been closely bound up together. There, however, is one root of the problem. For much of that history has been one of conflict; fourteen centuries too often marked by mutual hostility. That has given rise to an enduring tradition of fear and distrust, because our two worlds have so often seen that past in contradictory ways. To Western school children, the two hundred years of the Crusades are traditionally seen as a series of heroic, chivalrous exploits in which the kings, knights, princes - and children - of Europe tried to wrest Jerusalem from the wicked Muslim infidel. To Muslims, the Crusades were an episode of great cruelty and terrible plunder, of Western infidel soldiers of fortune and horrific atrocities, perhaps exemplified best by the massacres committed by the Crusaders when, in 1099, they took back Jerusalem, the third holiest city in Islam. For us in the West, 1492 speaks of human endeavour and new horizons, of Columbus and the discovery of the Americas. To Muslims, 1492 is a year of tragedy - the year Granada fell to Ferdinand and Isabella, signifying the end of eight centuries of Muslim civilisation in Europe. The point, I think, is not that one or other picture is

we fail to appreciate how others look at the world, its [illegible] our respective roles in it.

The corollary of how we in the West see our history has so often been to regard Islam as a threat - in mediaeval times as a military conqueror, and in more modern times as a source of intolerance, extremism and terrorism. One can understand how the taking of Constantinople, when it fell to Sultan Mehmet in 1453, and the close-run defeats of the Turks outside Vienna in 1529 and 1683, should have sent shivers of fear through Europe's rulers. The history of the Balkans under Ottoman rule provided examples of cruelty which sank deep into Western feelings. But the threat has not been one way. With Napoleon's invasion of Egypt in 1798, followed by the invasions and conquests of the 19th century, the pendulum swung, and almost all the Arab world became occupied by the Western powers. With the fall of the Ottoman Empire, Europe's triumph over Islam seemed complete. Those days of conquest are over. But even now our common attitude to Islam suffers because the way we understand it has been hijacked by the extreme and the superficial. To many of us in the West, Islam is seen in terms of the tragic civil war in Lebanon, the killings and bombings perpetrated by extremist groups in the Middle East, and by what is commonly referred to as "Islamic fundamentalism". Our judgement of Islam has been grossly distorted by taking the extremes to be the norm. That, ladies and gentlemen, is a serious mistake. It is like judging the quality of life in Britain by the existence of murder and rape, child abuse and drug addiction. The extremes exist, and they must be dealt with. But when used as a basis to judge a society, they lead to distortion and unfairness.

For example, people in this country frequently argue that the Sharia law of the Islamic world is cruel, barbaric and unjust. Our newspapers, above all, love to peddle those unthinking prejudices. The truth is, of course, different and always more complex. My own understanding is that extremes are rarely practised. The guiding principle and spirit of Islamic law, taken straight from the Qur'an, should be those of equity and compassion. We need to study its actual application before we make judgements. We must distinguish between systems of justice administered with integrity, and systems of justice as we may see them practised which have been deformed for political reasons into something no longer Islamic. We must bear in mind the sharp debate taking place in the Islamic world itself about the extent of the universality or timelessness of Sharia law, and the degree to which the application of that law is continually changing and evolving.

it is worth recalling another Arab proverb: "What comes from the lips reaches the ears. What comes from the heart reaches the heart."

The depressing fact is that, despite the advances in technology and mass communications of the second half of the 20th Century, despite mass travel, the intermingling of races, the ever growing reduction - or so we believe - of the mysteries of our world, misunderstandings between Islam and the West continue. Indeed, they may be growing. As far as the West is concerned, this cannot be because of ignorance. There are one billion Muslims worldwide. Many millions of them live in countries of the Commonwealth. Ten million or more live in the West, and around one million here in Britain. Our own Islamic community has been growing and flourishing for decades. There are nearly 500 mosques in Britain. Popular interest in Islamic culture in Britain is growing fast. Many of you will recall - and I think some of you took part in - the wonderful Festival of Islam which Her Majesty The Queen opened in 1976. Islam is all around us. And yet distrust, even fear, persist. In the post-Cold War world of the 1990's, the prospects for peace should be greater than at any time in this century. In the Middle East, the remarkable and encouraging events of recent weeks have created new hope for an end to an issue which has divided the world and been so dramatic a source of violence and hatred. But the dangers have not disappeared. In the Muslim world, we are seeing the unique way of life of the Marsh Arabs of Southern Iraq, thousands of years old, being systematically devastated and destroyed. I confess that for a whole year I have wanted to find a suitable opportunity to express my despair and outrage at the unmentionable horrors being perpetrated in Southern Iraq. To me, the supreme and tragic irony of what has been happening to the Shia population of Iraq - especially in the ancient city and holy shrine of Kerbala - is that after the western allies took immense care to avoid bombing such holy places (and I remember begging General Schwarzkopf when I met him in Riyadh in December 1990 before the actual war began to liberate Kuwait to do his best to protect such shrines during any conflict) it was Saddam Hussein himself, and his terrifying regime, who caused the destruction of some of Islam's holiest sites. And now we have had to witness the deliberate draining of the marshes and the near total destruction of a unique habitat, together with an entire population that has depended upon it since the dawn of human civilization. The international community has been told the draining of the marshes is for agricultural purposes. How many more obscene lies do we have to be told before action is actually taken? Even at the eleventh hour it is still not too late to prevent a total cataclysm. I pray that this might at least be a cause in which Islam and the West could join forces for the sake of

AS SPOKEN

SPEECH BY HRH THE PRINCE OF WALES
"ISLAM AND THE WEST"
DELIVERED AT THE SHELDONIAN THEATRE, OXFORD ON THE OCCASION OF HIS VISIT TO THE OXFORD CENTRE FOR ISLAMIC STUDI
WEDNESDAY 27 OCTOBER 1993

Ladies and gentlemen, it was suggested to me when I first began to consider the subject of this lecture, that I should take comfort from the Arab proverb, "In every head there is some wisdom". I confess that I have few qualifications as a scholar to justify my presence here, in this theatre, where so many people much more learned than I have preached and generally advanced the sum of human knowledge. I might feel more prepared if I were an offspring of your distinguished University, rather than a product of that "Technical College of the Fens" - though I hope you will bear in mind that a chair of Arabic was established in 17th century Cambridge a full four years before your first chair of Arabic at Oxford. Unlike many of you, I am not an expert on Islam - though I am delighted, for reasons which I hope will become clear, to be a Patron of the Oxford Centre for Islamic Studies. The Centre has the potential to be an important and exciting vehicle for promoting and improving understanding of the Islamic world in Britain, and one which I hope will earn its place alongside other centres of Islamic study in Oxford, like the Oriental Institute and the Middle East Centre, as an institution of which the University, and scholars more widely, will become justly proud.

Given all the reservations I have about venturing into a complex and controversial field, you may well ask why I am here in this marvellous Wren building talking to you on the subject of Islam and the West. The reason is, ladies and gentlemen, that I believe wholeheartedly that the links between these two worlds matter more today than ever before, because the degree of misunderstanding between the Islamic and Western worlds remains dangerously high, and because the need for the two to live and work together in our increasingly interdependent world has never been greater. At the same time I am only too well aware of the minefields which lie across the path of the inexpert traveller who is bent on exploring this difficult route. Some of wh[illegible] I shall say will undoubtedly provoke disagreement, criticism, misunderstan[illegible] and knowing my luck probably worse. But perhaps, when all is said and [illegible]

ST. JAMES'S PALACE
LONDON SW1A 1BS

12th January 1994

Dear Mr. Khan,

The Prince of Wales has asked me to thank you for your letter.

His Royal Highness much appreciates the trouble you took to write and send the book which you kindly enclosed.

The Prince of Wales has asked me to send you his sincere thanks and best wishes.

Yours sincerely,

Maureen A. Stevens

Maureen A. Stevens

Speech enclosed

Reproduced in the following pages is Speech of His Royal Highness, the Prince of Wales, received in our Denmark Office in acknowledgment of the Book " Islam and Challenge to Religion" sent to His Royal Highness by our representative Mr. Zafar A Khan.